

پارہ 1



سمیرا حمید

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سمیرا حمید



”امریم کا انگر کوئی لاڈ کا نام ہوتا تو وہ ”سرمای“
 دھوپ” ہوتا۔ ”چکیلی“ روشن، مسکور کر کے، باندھ
 کے، سراٹھوا کر، بازو پھیلوا کر آسمان کی اور اڑالے
 جانے والی یہ سرمای دھوپ۔۔۔
 باجر کو اندر سے پرسکون کر دینے والی۔۔۔ اندر کو باہر
 سے لا لعلق کر دینے والی۔۔۔
 سونا سونا ہوتی۔۔۔ سونا سونا پھیلتی۔۔۔ سمگن ست
 بہاراں کر دینے والی سرمای دھوپ۔۔۔
 سر سرگم کے سارے گھاسی۔۔۔ ابتدا کی طرف۔۔۔
 انتہا کی جانب جیسے راج ہنسل کے غول کے غول جھوم
 جھوم جاتے ہوں۔۔۔ اور اسی غول میں یک رنگ اور

مکمل ناؤل



بیٹھی دادی زیر لب برہماتے ہوئے اپنے بالوں کا خود ہی مساج کر رہی ہیں۔ انہوں نے دانیہ سے کہا تھا لیکن اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے تو کچھ سنا ہی نہیں۔ اور وہ کامل توجہ سے ”نان بابی کی بیٹی“ پڑھتی رہی ساتھ ماٹنے کی پھاٹکیں بھی منہ میں ڈالتی رہی۔

اماں فون پر بات کر رہی ہیں۔ اور حملہ کانونوں میں ابر فون لگائے میوزک سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کیونکہ اسے چلنے میں خاصی دشواری ہو رہی ہے اور اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں ایسے مڑ مڑ کر لہرا رہے ہیں جیسے خدا نخواستہ اسے ٹھلٹھلتے مڑی کا دورہ پڑ رہا ہو۔

اور وہ کونوں میں خود کو چھپانے والی موبائل انٹرنیٹ پر مصروف ہے۔ نہیں نہیں وہ کسی سوشل میڈیا ورکنگ سائٹ پر نہیں ہے۔ وہ کسی سے چیٹ بھی نہیں کر رہی۔ ارے نہیں وہ گوگل ایسجیڈ پر مشہور ڈیزائنرز کے کپڑوں کے ڈیزائن بھی نہیں نوٹ کر رہی۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو مائجسٹر یونیورسٹی کے پاکستانی اسٹوڈنٹ سوسائٹی کے گروپ لیڈر کی اسی میل پڑھ رہی ہے۔ اور اس کے ہاتھ پیر ایسے کانپ رہے ہیں جیسے ابھی ابھی اسے فریزر سے نکال کر وہوپ میں رکھا گیا ہو۔ یا جیسے اس کے کان میں کہا گیا ہو کہ جہاں تم بیٹھی ہو ٹھیک وہیں خزانہ دفن ہے۔ چپکے سے نکال لو۔ اب وہ یہ خزانہ چپکے سے ہی نکالے گی۔ اس سے اپنی چیخ دبائے نہیں دب رہی۔ اور اس نے ہلکی سی چیخ ماری دی۔

سب سے پہلے تو دادی نے ہی اپنا ہاتھ روک کر اسے ناگواری سے دیکھا پھر سوائے دادا کے سب نے اس پر ایک ہلکی سی ناگواری سی نظر ڈالی مگر کسی نے اس سے پوچھا نہیں کہ کیا ہوا؟ کیوں چلائی ہو؟ دادا جو توتہ النصوح پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اس کے پاس آئے۔

”امرحہ۔ کیا ہوا؟“ ہمارے دادا صرف وہی پوچھتے تھے وہ دادا کے کان میں کھسک پھرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دادا توتہ النصوح کو سینے سے لگا کر

کھڑے ہوئے۔

”اوپلے لینے ہیں منڈی سے۔ مجھ سے کہاں اٹھائے جائیں گے اتنے۔ امرحہ! تم آجاؤ ساتھ۔“

”اسے لیے جارہے ہو۔ مل گئے پھر۔ منڈی بند ہو جائے گی یا آگ لگی ہوگی منڈی میں۔“ دادی کی باریک آواز زوننی ہتھوڑے کی طرح برسی۔

”ہم دو سرے شہر کی منڈی میں چلے جائیں گے۔ اگر وہاں بھی آگ لگی ہوئی تو ہمارا انتظار نہ کرنا۔ ہم شہر شہر منڈی منڈی آگ لگا کر آئیں گے۔“

”شہر شہر کیوں۔ ملکوں ملکوں کیوں نہیں۔؟“

”ہاں بھئی اب تیار رہنا سب۔ دنیا میں آگ بھڑکنے والی ہے۔“

”اب کی۔۔۔ کب کی بھڑک چکی۔“ دادی نے فوراً ٹوکا۔

”بالکل۔۔۔ وہ ناگاساکی۔“

”جاؤ جاؤ میزاد مل غنہ کھاؤ۔“

”بی بی! امرحہ نے ذرا گھور کر دادی کو دیکھا اور دادی نے اپنا سر بدل لیا۔

”لو اب یہ مجھے جسم کرے گی۔“ انہوں نے خود پر آیات مبارکہ پڑھ کر پھونکیں۔

امرحہ وہیں کھڑی انہیں گھور رہی تھی اور وہ مزید رخ موڑ کر زیر لب دعائیں پڑھ پڑھ خود پر پھونکنے لگیں۔ بہت خوفزدہ رہتی تھیں اس کی نظروں سے۔

سب ہی رہتے تھے۔ تباہی اور بربادی بھی وہ۔

عین اس کی پیدائش کے دن بڑے تایا چل بے۔

پھوپھی پھوپھا کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ چھوٹی پھوپھو کے گھر شارٹ سرکٹ سے آگ لگی اور

سارے ساندو سامان کو نکل گئی۔ چچا کی بیٹی کی منگنی

اس دن ہونا تھی۔ تایا کی وفات سے وہ ملتوی ہوئی۔ بعد

ازاں رشتہ ہی ختم ہو گیا۔ اور تو اور ماموں کی

ایکٹھونکس کی دکان میں پورے چار لاکھ کی چوری ہوئی

ماموں صدے سے چار دن ہسپتال رہے۔ امرحہ

سے بڑے علی کی چھت سے گر کر بائیں ٹانگ کی ہڈی

ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ پورے دو سال لنگڑا کر چلنا رہا۔ ساتھ کے گھر کی ملائیکہ آئی بیوہ ہو گئیں۔ ان کے شوہر کا فرانس میں ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا اور دو سری لین والوں کی بہو کے مرہ بچے کی پیدائش ہوئی۔

سب تو اوپر اوپر کے واقعات تھے۔ فہرست کافی لمبی تھی اور دن بہ دن لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

”بس اماں جی! اپنے دھیان میں تھی۔ پتا ہی نہ چلا

کب منا ہاتھ جلا بیٹھا۔“

دادی پوچھتیں کیا دن تھا۔؟

”یہی منگل۔۔۔ آج ہی کے دن۔۔۔ بلک بلک کر

رویا میرا حشر۔ میں بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔“

”اچھا منگل۔۔۔ اور تاریخ کیا بنی۔“

”تاریخ یہی وہ۔“

”اچھا۔۔۔ دو اور اوپر سے منگل۔۔۔ مدد بھئی بی! منگل

کی دو کو ہمیں یہ وہاں نصیب ہوا تھا۔ اس دنیا پر یہ

امرحہ عذاب بن کر آئی تھی۔ ہمارے خاندان میں تو

ہر تاریخ دو ہر دن منگل۔ کیا کریں گناہوں کے

عذاب بھی تو بھگتتے ہی پڑتے ہیں نا۔“

اگلی بار منے کے ہاتھ جلنے کا قصہ بھی اس ”نجس جنم

پتری“ میں شامل کر دیا جاتا۔

اماں بھی چڑی رہیں اس سے۔ اتفاق سے ہر

ملنگ بھگ اسی دن ماموں کی دکان پر تین بار چوری

ہو چکی تھی۔ تنگ آکر ماموں نے دکان ہی بیچ دی اور

دوسرا کاروبار کرنے لگے۔ اماں کو بھولتا ہی نہیں تھا کہ

کیسے ان کے بھائی کی چمکتی دکتی شان دار دکان بک گئی

اور بھائی کنگلا سا ہو گیا۔

ایک دادا تھے جو پانچ وقت نماز پڑھتے اور صرف اللہ

سے ڈرتے۔ احادیث پر عمل کرنے کی کوشش بھی

کرتے۔ جاہلانہ باتوں اور خیالات کو اپنے اندر چسکی

بلا کر جگہ نہ دیتے۔ ورنہ جمعرات کے جمعرات ان

کے گھر چراغ جلتے۔ تین یا پانچ۔ بس طاق۔

جفت نہیں۔ دادی مرنے والوں کے نام سے چھت کے کوٹے والے کمرے میں چراغ روشن کرواتیں۔

”لانا بھ ہو سب کے سب۔ کیا کبھی روضہ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چراغ جلتے دیکھے ہیں۔

کیوں خلاف مذہب ایسے کام کرتے ہو؟“

دادی ہاتھ سے اشارہ کرتیں کہ جاؤ اپنا کام کرو۔

بابا نے اعظم مارکیٹ میں دکان کی نئے سرے سے

آرائش کروائی تو افتتاح کے وقت تاریل پھوڑا۔

اعظم مارکیٹ کے دوسرے دکان دار ہنس ہنس کر لوٹ

بوٹ ہوتے رہے۔ اب صرف اتنا ہی کہتے رہے کہ وہ

فلکوں میں دیکھتے تھے تو انہیں بڑا اچھا لگتا تھا۔

”کیا ہوا جو کر لیا تو۔۔۔ تم سب تو کسی کو خوش بھی

نہیں دیکھ سکتے۔ جمعرات کے جمعرات بابا چار دیکھیں

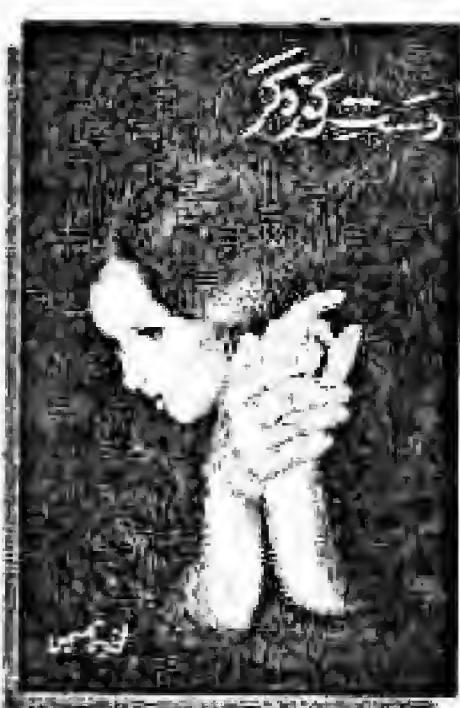
دیتے تھے۔“ دادا نے کہا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ کدھر

فوزیہ یاسمین



قیمت - 750/- روپے

محلہ نمبر:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر 32735021

”کام والی ماسی کی بچی کے کان کا آپریشن ہوتا ہے۔ پیپ رستی ہے اس کے کان سے۔ رات دن کی جان لیوا تکلیف الگ سے۔ اور نہیں تو دو تین جھڑپوں کے میسے دے دو۔ کچھ میں ڈال دوں گا۔ اس کا آپریشن ہو جائے گا۔“

بہت بحث ہوئی۔ بابا نے دادا کو لاوین قرار دے دیا اور دادا نے بابا کو بے حس۔ خیر و عین تو پتی رہیں کام والی کی بیٹی کا جیسے تیسے دادا نے آپریشن کروادیا۔ تو بس یہ ماحول تھا گھر کا اور یہ حال تھا گھر والوں کا۔ غلط باتوں کو پکڑ کر بیٹھے رہتے۔ بحث بھی کرتے اور اسی پر لڑ مارتے۔ دادا تو بہت بے زار اکتائے اکتائے رہتے۔ لیکن کسی پر بس ہی نہیں تھا۔

”نہیں ملے ناو لے۔“ جب دونوں خالی ہاتھ گھر آئے تو دادی چمک کر بولیں۔ ”تم تو کہہ کر گئے تھے دنیا میں آگ بھڑکا کر ہی واپس پلٹیں گے اب ایسے کیسے واپس آگئے۔ اور امجدہ اتم انتابن سنور کرواوا کے ساتھ منڈی گئی تھیں۔“ دادا پوتی دونوں خاموشی سے کھسک گئے۔

ایسا نہیں تھا کہ ایک دادی ہی اسے منحوس مانتی تھیں۔ دادی اور اماں کی دیکھا دیکھی باقی بیٹیوں بہن بھائی بھی دادی کے کے پر یقین رکھتے تھے اور کچھ سے زیادہ بابا بھی۔

علی کی پتنگ کٹ جاتی تو چلاتا۔ ”کس منحوس نے کہا تھا اوپر آنے کو کٹ گئی تا میری پتنگ۔“ وہ علی کو دوسنا کر چھپ کر رونے لگتی اور خود کو کوسی جاتی۔

”میں منحوس ماری۔ میں منحوس ماری۔“ دانیہ چپکے سے اماں سے کہا کرتی۔

”میرے پٹرے لایا کریں تو امجدہ کو نہ دکھایا کریں۔ بتا نہیں کہوں میرے بہنے سے پہلے وہ دیکھ لیتی ہے تو مجھے زہر لگنے لگتے ہیں۔“

امجدہ غصے میں کپڑوں پر سیاہی چکرائی کا داغ لگا دیتی اور وہاں لگاتی جہاں سے صاف ہو کر بھی صاف نہ ہوتا۔ اور پھر رات کو کہیں چھپی بیٹھی روتی جاتی۔

”میں منحوس ماری۔ میں منحوس ماری۔“ اس منحوس ماری کو دادا نے ذرا سنبھالا۔ ان کی کے کمرے میں ایک طرف اس کا بیڈ رکھا تھا۔ ان کی کے ساتھ بازار جاتی، سہیلی کے گھر جاتی۔ ان ہی سے میسے لیتی۔ دادا ہی اس کے اماں بابا، بہن بھائی بن گئے۔ ایک رات اس نے بابا کو اماں سے کہتے سن لیا۔ ”دکان پر چار لاکھ کا لکڑی کا کام کروانے جا رہا ہوں۔ کسی کو بتانا نہیں۔ نظر لگ جاتی ہے۔ خاص کر اپنی امجدہ کو۔“

وہ رات بھر روتی رہی۔ چپکیاں لیتی مٹی۔ بد دعاؤں دیتی مٹی کہ وہ مرجائے یا لکڑی کے ساز و سامان کو آگ لگ جائے۔ لیکن نہ وہ مری نہ سامان کو آگ لگی مگر۔ بابا کے چار لاکھ روپوں میں سے پورے ڈیڑھ لاکھ کم ہو گئے۔ چھوٹی پچھو آئیں اور اپنی کوئی ضرورت بتا کر پیسے لے گئیں۔ بابا اماں سے چڑھ گئے۔ ”کہا تھا نا، کسی کو مت بتانا۔ لو کرواوا دکان کا کام۔“

سارا عذاب امجدہ پہ نہ آجائے دادا نے اپنے دوست سے لے کر پیسے پیسے اور پھر کہیں جا کر ٹارپل پھونکا دکان کے آگے۔

تو یہ حیثیت ہے ہماری ہیروئن کی کہ پیدائش سے لے کر بڑے ہونے تک ایسا ہزاروں بار ہوا۔ وہ بول لیتی۔ بہن بھائیوں کو مار بھی لیتی لیکن رات رات بھر روتی بھی رہتی۔ اس کا جی چاہتا کہیں بھاگ جائے چھپ جائے۔ گم ہو جائے کہ کسی کو یاد نہ رہے کہ اس کی پیدائش کی خبر سننے ہی دادی کے دامن میں موج آگئی تھی۔ بعد ازاں اماں کے کردار نے بھی اماں کو سکون کا سانس نہ لینے دیا۔

دانیہ، حماد، علی بھی جل کر کبھی مذاق اور کبھی صرف اسے روتے دیکھنے کے لیے اسے اس کی نحوست کے قصے سناتے رہتے کہ وہ بھول نہ جائے کہ وہ کون ہے۔ اسکول میں ایک بار ٹیچر کی کرسی کا پاپہ جو عرصے سے ٹوٹ جانے کے قریب تھا ٹوٹ گیا اور ٹیچر جی دھڑام سے نیچے آگئیں تو وہ فوراً کھڑے ہو کر

دبنے لگی اور اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”پچھپ۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ کرسی خود بخود ٹوٹا ہے۔ میں سچ بول رہی ہوں۔“ ٹیچر بھی سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیتیں کہ سر میں درد ہے تو وہ سہم جاتی۔ ”میں نے آپ کے سر کو نہیں دیکھا۔ سچ بالکل نہیں دیکھا۔“ خاندان کی تقریبات میں وہ انہی کارناموں کی وجہ سے جاتی نہیں تھی جو سارے خاندان میں ایسے مشہور تھے جیسے شالوں میں کشمیری شال اور میووں میں چلتوزہ۔

ایک بار وہ گئی تو بارات جسے دن دو بجے دوسرے شہر سے آتا تھا، آئی ہی نہیں۔ شام سے رات ہو گئی۔ ان کی گاڑیاں موڑوے پر خراب کھڑی تھیں۔ دو لہا باراتیوں کے بغیر آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب تک لاہور سے نئی کاریں بھیجی اور وہ سب اس میں بیٹھ کر آئے رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سب مہمان جا چکے تھے اور صرف قریبی عزیز ہی موجود تھے۔ وہ بھی دادا کے ساتھ چپکے سے گھر واپس آگئی اور اپنے نئے ڈزائنڈ ٹریس کو آگ لگا دی۔ اس کے سب کزنز اس کے گرد گھیرا بنائے اس کا ریکارڈ لگانے میں مصروف تھے۔

”نانا! ذرا پوچھے کھانا جل گیا یا بج گیا۔ امجدہ آئی ہیں نا آج۔“ بچگی کے کنکشن بھی چپک کر اٹھ گئے۔ ”شارٹ سرکٹ سے آگ نہ بھڑکا اٹھے۔“ ”میں تو دعا کرتی ہوں کہ دو لہا بھائی خیریت سے آجائیں۔“

”مجھے تو دلہن کی فکر ستانے جارہی ہے۔ سنا ہے دو لاکھ کا لنگا چلتے چلتے بجا ہے۔“

”نہنگا تو بج گیا لیکن اس کے بال جل گئے۔ ویسے آئین مشین بال جلاتی تو نہیں۔ مگر خیر۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے آج تو۔“

”ہم سب تو مذاق کر رہے تھے امجدہ تو سنجیدہ ہی ہو گئی۔“ وہ رونے جیسی ہو جاتی تو کوئی کہہ دیتا۔ تین گھنٹے بعد اس کا خالہ زاد جلا بھنا آیا۔

”چارپانچ گھنٹے سے پہلے بارات نہیں آئے گی۔ سب امجدہ سے سو رہی گئیں۔ اس نے ہمارا سو رہی قبول کر لیا تو شاید بارات جلدی آجائے۔“ ”شٹ اپ۔“ وہ اتنی زور سے چلائی کہ دس بارہ کا گروپ سن سا ہو گیا۔

”میں تمہارا منہ توڑوں گی حسان۔“ ”منہ تو تمہارا توڑا جانا چاہیے جو اپنی ساری نحوست لے کر میری بہن کی شادی خراب کرنے آگئیں۔“

امجدہ کا جی چاہا وہ سارے ہنڈال میں آگ بھڑکا دے۔ کاش واقعی شارٹ سرکٹ ہو جائے اور سارے روشن قلعے بجھ جائیں۔ تاکہ اس کے دھڑپ مار مار کر روتے تاریک چہرے اور کپکپاتے وجود کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ وہ کب سے سب کے مذاق میں چھپے طنزوں کو جھیل رہی تھی۔ لیکن حسان تو دندا ناہو اس پر الزام لگانے ہی آگیا تھا۔

”وضو کرنے کے بعد مسجد جانے سے پہلے خود کو آئینے کے سامنے کھڑا کر کے ضرور دیکھنا۔ شاید دوبارہ کبھی مجھے یہ سب کہتے تمہاری زبان لڑکھڑا جائے۔ اور کہیں یہ بات سمجھ میں آجائے کہ کچھ بھی بریاد اور آباد کرنے کی طاقت انسان کے ہاتھ میں ہے نہ اختیار میں۔“ ”حکم کن اور عمل فیکون۔“ رب کی خوبی ہے اس کے بندوں کی نہیں۔“ بمشکل خود کو رونے سے بچاتے اس نے کہا۔

دادا کو لے کر وہ چپکے سے گھر آگئی۔ اس کی سگی خالہ زاد کی شادی تھی اس کے دل میں بھی ارمان تھے شادی کو لے کر۔ اس نے خاص اس شادی کے لیے بہت تیاریاں کی تھیں۔ لیکن سب نہ صرف بے کار گیا بلکہ اسے دکھ دے کر گیا۔ اس نے ایک سفید کانڈیر ”میں کبھی کسی تقریب میں نہیں جاؤں گی۔“ کبھی بھی نہیں۔ وعدہ ”لکھ کر اپنی الماری کے اندر دھکی دیا۔“ جب کبھی اس کا کہیں جانے کو دل چاہتا وہ الماری کھول کر اپنے وعدے کو یاد کر لیتی۔ یہ سب وہ کرتی تو کوئی لیکن بہت اکیلی بھی ہوتی گئی۔

وہ آسانی سے رو پڑتی۔ اسے آسانی سے رلایا جا سکتا۔
جیسے کہ کوئٹہ والے ماموں سال میں کبھی ایک بار آجاتے تو لحاف میں دبک کر کافی کا بڑا ٹک پیتے ہوئے کہتے۔

”بلاؤ ذرا امرجہ کو۔۔۔ اسے رلائیں۔“

وہ نہ جاتی تو ماموں کھینچ کھانچ کر لے جاتے۔ ہنس ہنس کر سب لوٹ پوٹ ہوتے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہوتی اور ماموں اس کی نحوست کا ایک ایک قصہ حوالہ جات کے ساتھ سناتے جاتے۔ اماں اسے ڈانٹتی۔

”مذاق کر رہے ہیں ماموں امرجہ۔۔۔ کیوں ایسے دھاڑیں مار رہی ہو۔“ دادا آتے سب کو ڈانٹ کر لے لے جاتے۔

”جاہل لوگ ہیں امرجہ! یہ ان پر توجہ نہ دیا کرو۔“ وہ کون سی عالم بھی جو خود کو اچھی طرح سے سمجھا لیتی۔ نو عمر۔ نازک دل کی۔ بس رو دینے والی لڑکی ہی تو تھی اور پھر ہر بار تو خود کو فلسفوں سے مطمئن نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”سب جاہل ہیں۔“ پر سکون ہو جاؤ۔

”سب پاگل ہیں۔“ ہاں یہ ٹھیک ہے۔

ایسا سوچا جاسکتا ہے۔ کہا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسا ٹھیک ٹھیک ہو نہیں پاتا۔ رزلٹ اگر سو فیصد ہوتا بھی تو اگلی بار ”صفر“ ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ جتنا خود کو ”یہ سب جاہل ہیں“ کہہ کر سلاتی، اتنا ہی اگلی بار ان سب جاہلوں کی باتوں پر ہنسیوں سے روٹی۔ دادا کی باتیں اسے ٹھیک ٹھیک کر سلاتی تھیں تو اسی نیند میں وہ ان سب کی باتوں پر کراہی تھی۔

دادا گور نمٹ پنجاب پبلک لائبریری میں لائبریرین تھے۔ اسکول کی چھٹیوں میں وہ سارا دن پنجاب لائبریری میں گھومتی پھرتی رہتی۔ ویسے بھی اسے کم سے کم گھر میں رہنے دیتے تھے وہ اسکول سے

پیدل چل کر لائبریری آجاتی دونوں دھپہ کا کھانا دینا کھاتے، اسی ملازمت سے دادا حضور نے پڑھائی کتابیں بڑھی تھیں اور اسی لیے وہ جمعرات کو مرنے والوں کے نام کے دیے نہیں جلاتے تھے شام کو دونوں چل قدمی کرتے سال کی لمبی سڑکوں سے ہوتے سردی گرمی بھنے جتے اور راکھ کی چلی کھاتے رات گئے گھر آتے۔ امرجہ کا تو دل چاہتا کہ رات کو بھی گھر نہ جائے اور بھلے سے مال کے فٹ پاتھ پر سو جائے۔ گھر پر نظر پڑتے ہی دادا کہتے۔

”لو آگئی جیل۔“

”پاگل ہو گئے ہو تم تو کتابیں پڑھ پڑھ کسے ڈھنگ کی نوکری مل جاتی تو عقل تو نہ جاتی۔“

لیکن دادا کو ڈھنگ کی نوکری تو نہ ملی لیکن ڈھنگ سے عقل ضرور مل گئی۔ بابائے اپنے زمانے کی آٹھ کو بھی جیسے اپنی دوکان پر رکھ کر سیل کر دیا۔ یہاں نہ چلا کہ آٹھ جماعتیں پڑھے ہیں یا آٹھ تک گنتی۔ علی بڑا تھا اور کمال کا بڑا تھا۔ ہر جماعت میں سینئر ہی رہتا وہ سال ضرور ہی لگتا۔ پھر حماقتا۔ اسے دنیا بھر کے

گلے والوں، ناچنے والوں، انہیں نچانے والوں کے نام گھر، شہر، قومیت، مذہب، شادی، بچوں، اذیت کے بارے میں تو معلوم تھا لیکن یہ نہیں کہ ایف اے کے بعد کی ڈگری کو کیا کہتے ہیں اور اسے پاس کیسے کرتے ہیں۔ کتنا چاہا دادا نے کہ ایک انجینئر بن جائے ایک کم سے کم دیال سگھ کانج میں ٹیکچران۔ ورنہ ایک کسی ہسپتال میں ڈاکٹر اور ایک پاک آرمی میں کپتان۔ لیکن دادا کے سوچنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ ویسے ان کے کہنے سے کچھ بھی نہیں ہوا۔

پھر امرجہ کا نمبر تھا ”کم وہ بھی نہیں تھی اور کیونکہ منحوس ماری تھی تو ہر وقت روٹی رہتی۔ بڑی مشکل سے دادا نے اسے آٹھ جماعتیں پاس کروائیں اپنے رونے کے دوران ایک بار تو اس نے پڑھائی چھوڑ دیے کا فیصلہ کر لیا اور عمل بھی۔ سارا سارا دن بولوا کے ساتھ لائبریری رہتی۔

دادا نے مینٹ کی ”امرجہ میٹرک کرلو۔“

ننہ امرجہ کے کانوں پر جوں نہ رہ سکی۔ بس ہر ایک ہی رٹ ”بھاگ جاتے ہیں گھر سے“

دادا کے پاس تھوڑے سے جو پیسے تھے ان سے اسے اپنے دوست کے گھر بلوچستان لے گئے ہفتہ رہ کر آئے۔ خاندان میں تو کہیں وہ جاتی نہیں تھی۔ وہاں بہت خوش رہی۔ پھر دادا سے کہنے لگی۔

”دادا آپ دعویٰ چلے جائیں پھر مجھے بھی وہیں بلا لیتا۔“

”بہت خوش رہیں گے ہم دونوں۔“

دادا اس عمر میں کیا دعویٰ جاتے ہاں پھر بھی اس سے وعدہ کر لیا۔

”میٹرک کر لو پھر چلا جاؤں گا۔“

اس نے دعویٰ کے لیے۔ میٹرک کر لیا۔ خوب

ملی جان لگا کر کیا مگر اتنی جی جان لگانے پر بھی سیکنڈ

لاؤن میں۔ جو ہر کس و نا کس کے ہاتھ آتی جاتی ہے۔

اسی دنوں نیا نیا واقعہ ہوا تھا کہ بابا کا ہاتھ جل گیا۔

داوی بولنے لگیں اس نے آگے سے جواب دیے تو بابا نے غصے سے جلا ہوا ہاتھ ہی اس کے گل پر ٹھونک دیا۔

اور مزید غصے سے اس نے اپنا سر دیوار میں زور سے دے مارا۔ اس کے خون نکلا۔ سر میں بہت درد ہوا

اور اس درد اور خون کو بھلا کر وہ بابا کے پھپر کو لے کر روٹی رہی۔ رات کے پہلے پرے سے آخری پر تک

پھر اپنے اسکول بیگ میں اپنے چند کپڑے رکھ کر گھر سے نکل گئی۔ چلتی گئی۔ چلتی گئی۔ گھر کی

سڑک کو پار کیا۔ بڑی سڑک تک آئی۔ اسے بھی پار کر گئی، چلتی گئی۔ چلتی گئی۔ حد تو یہ کہ پہلی بار سڑک

پر یہاں وہاں پھرتے آوارہ گندے سندنے کتوں سے ڈانگل نہیں ڈری۔ وہ آنکھوں میں اشک لیے۔

گندے ہر اسکول بیگ لٹکائے ایسے چلتی جا رہی تھی جیسے خدا نخواستہ دنیا میں اکیلی ہو۔

کچھ دور آگے جا کر سمجھ میں نہ آیا کہ اب کہاں

جائے۔ تو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

”تھکا ڈالا تم نے مجھے امرجہ! دادا اسی فٹ پاتھ پر

اس کے ساتھ بیٹھ گئے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ پہلے خود پانی پیا پھر اسے پلایا۔

”میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔“ پانی پی کر وہ چلائی۔

”ایک دن تو تمہیں وہ گھر چھوڑنا ہی ہے۔ وہ تمہارا گھر ہے بھی نہیں میرے بچے۔“

”جائے کیوں نہیں ہیں آپ دعویٰ۔ کر لیا ہے نا میں نے میٹرک۔“

دادا گڑبڑا گئے۔ ”میں بوڑھا، کمزور، بیمار، شیمار رہنے والا بندہ اب کہاں جاؤں گا ملک سے باہر وہ بھی کمانے

۔ خود سوچ بچے۔ کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں میں۔ اور ہر ابھی تو ہو گیا ہوں۔“

”تو وعدہ کیوں کیا تھا؟“

دادا بہت دیر چپ ہی رہے۔ نو عمری پھر امرجہ جیسا دکھی دل۔ اب کوئی جھولی تسلی اسے نہیں دی جاسکتی تھی۔

”تم کیوں نہیں چلی جاتیں امرجہ؟“

”کہاں۔“ اس نے کندھے سے اسکول بیگ اتارا۔

”دعویٰ امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا، فرانس۔“

”میں امریکا، فرانس۔“ وہ اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی کہ دادا کو کیسے کیسے لطیفیاد آرہے ہیں۔ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

”ہاں نا۔ مرزا کمال کی نواسی نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا ہے اس سال۔ اسے اسکا رشب ملتا ہے۔

دو دن ہوئے وہ کینیڈا چلی بھی گئی۔ امرجہ! تو بھی ایف ایس سی میں ٹاپ کر لے۔“

”میں۔۔۔؟“

”ہاں امرجہ بچے۔ ٹاپ کر اور چلی جا۔ مرزا کمال کی نواسی سات سال بعد آئے گی بلکہ سمجھ آئے گی ہی نہیں۔ پڑھائی ختم ہونے کے بعد اسے کینیڈا

میں ہی تین سال لازمی سروس کرنی ہوگی۔ یوں ہو

گئے دس سال۔ دس سال وہ بھی کینیڈا میں۔ جہاں ہیں پچیس لاکھ لگا کر جایا جاتا ہے وہ مفت چلی گئی۔ دیکھ لو امرجہ ابرہائی کے کتنے فائدے ہیں آپ خود کو منوالو تو دنیا آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ ”رات کے آخری پھر سڑک کے کنارے بیٹھے دادا اسے فلسفہ کے معلم اول ارسطو سے کم نہیں لگ رہے تھے جو سکندر اعظم کو تاریخی فاتحوں کی فتوحات بڑے سلیقے سے سمجھا رہا تھا۔

اور پھر سکندر اعظم بھی تو فاتح رہا تھا۔ اور یوں اس نے بہت دل سے دادا کے ساتھ جا کر کالج میں داخلہ لیا۔ رات دن پڑھائی۔ بس پڑھائی۔ ٹاپ کرنا ہے اس نے خود پر لازم کر لیا۔ اسے اتنا یقین تھا خود پر کہ وہ خود ہی سب فرینڈز مگلاس فیلوز کو بتاتی پھرتی۔

”مجھے تو کینیڈا اجانا ہے۔ پورے دس سال رہوں گی وہاں۔“
”ڈاکٹر بن جاؤں گی۔ مزے سے اپنی زندگی گزاروں گی۔“
”ہاں ہاں میرے پلان میں ہمیشہ سے یہی شامل تھا مجھے اپنی زندگی کسی یورپین کنٹری میں ہی گزارنی تھی۔“

”بس کسی طرح سے یہ دو سال گزر جائیں۔ امتحانات ہوں اور میں جاؤں۔“

ان دو سالوں میں وہ بہت خوش رہی۔ اس نے کینیڈا کی اتنی معلومات اکٹھی کر لیں کہ خود کینیڈین بھی وہ سب نہیں جانتے ہوں گے جو وہ جاننے لگ گئی تھی۔ دادا نے اسے وہ ساری کتابیں لادیں جن میں لفظ کینیڈا شامل تھا۔

اور پھر رزلٹ آگیا۔ لیکن افسوس۔ وہ اسے پس بھی نہ لے سکی۔ دو رو کر اس نے اپنا حشر کر لیا۔ دادا نظریں چرائے چرائے پھرتے چکے چکے دو تین جگہ اپلائی کیا اسکا رشپ کے لیے، لیکن جہاں ڈبل پس والوں کی بھرمار ہو وہاں خالی خالی ”اے گریڈ“ کو کون پوچھتا ہے۔ دادا کو ان دونوں معلوم ہوا کہ ملک میں کتنی

بڑی تعداد لائق فائق لوگوں کی ہے۔ جہاں جہاں اس کا فارم جمع کروانے گئے تھے وہاں جم غفیر دیکھ کر انہیں خوشی تو ہوئی لیکن اپنی امرجہ کے لیے افسوس بھی ہوا۔ وہ اسی وقت سمجھ گئے کہ اسے مشکل سے ہی کوئی اسکا رشپ ملے گا۔ اور وہی ہوا۔ اسے محضت کے تین آفیشل لیٹر آگئے اور ان کی طرف سے ایڈمیشن فارم نہ آئے۔

گھر والوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ دادا پوتی کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ امرجہ کا بخار اترنے کا نام کیوں نہیں لے رہا۔ امرجہ اور دادا میں بات چیت کیوں بند ہے۔ امرجہ اب دادا جی دادا جی کیوں نہیں کہتی پھرتی۔ اوپر سے کلاس فیلوز اور فرینڈز کے فون آتے رہے۔

”کب جا رہی ہو کینیڈا۔ دیکھو مل کر جانا۔“
”ہمت ہے تمہاری جوا تنی دور جا رہی ہو۔ میں تو سوچ کر ہی مرنے لگتی ہوں۔“

اس نے دو سالوں میں اتنے یقین سے اپنے جانے کے بارے میں کہا تھا کہ سب کو کامل یقین تھا کہ اب بس وہ گئی۔ وہ سب طنز نہیں کرتی تھیں پر امرجہ کو تو طنزی لگ رہے تھے نا۔

بابا نے اس کی منگنی کر دی۔ اس نے بھی کوالی کہ کینیڈا تو گئے نہیں دو سرے گھر ہی چلو۔ لیکن دو سرے گھر بھی نہ جاسکی۔ چھ ماہ بعد ہی منگنی ٹوٹ گئی۔ ظاہر ہے انہیں بھی خبر ہو گئی کہ اس لڑکی کی پیدائش اور بعد از پیدائش سے کیسے کیسے واقعات جڑے ہیں۔ بابا کو غصہ تو بہت آیا لیکن کیا کر سکتے تھے۔ اماں اور دادی پر ناراض ہوئے کہ کیوں ایسی ایسی باتیں کر کے اسے اتنا مشہور کر دیا ہے کہ اس کا رشتہ ہی ختم ہو گیا۔ اماں اور دادی پچھتا میں پر اب تو دیر ہو چکی تھی۔

پھر دو سرا رشتہ ہوا۔ بابا نے فوراً ”شادی کی تاریخ دے دی لڑکے والوں کو۔ نہ منگنی نہ نکاح فوراً شادی اور عین شادی سے پندرہ دن پہلے جس دن وہ اپنا شراب

پن کر دیکھ رہی تھی اسے لڑکے کی جوان بہن کے بیوہ ہونے کی خبر ملی۔ قصہ ہی ختم۔

اور اس بار اسے خاندان سے وہ کچھ سننے کو ملا کہ اس نے دادی کی نیند کی گولیاں کھالیں۔

بہتے بعد جب وہ ٹھیک ہو کر گھر آئی تو اس کا جی چاہا کہ پھر سے گولیاں کھالے اور فوراً ”مر جائے۔ اماں

بابا کو ان کھدروں میں چھپ چھپ کر روئے ہوں۔“
دادی ”ہائے میری جوان بچی، ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔“

کہہ کہہ ہچکیاں لیتی ہوں۔ اور دادا ہمیشہ کے لیے اس گھر کو چھوڑ دیں اور بابا دادی دونوں کی طرح دادا کو دھونڈتے ہوں اور دادا رات کو چھپ کر اس کی قبر پر آتے ہوں۔ اسے اپنی موت کے تصور سے ایسے

راحت ملی کہ سب روتے پھرس گئے جنہوں نے اسے رلایا ہے مگر وہ صرف یہ تصور ہی کرتی رہی دوبارہ ہمت نہ ہوئی موت کو گلے سے لگا لے۔ دادا اس سے بات کرنے کی اسے منانے کی کوشش ہی کرتے رہتے۔

جوان لڑکی نے خود کو ختم کر لینے کی کوشش کی اور یہ سب ان جاہلانہ باتوں کی وجہ سے ہوا تھا جو وہ بچپن سے اپنے لیے سن رہی تھی۔ اگر وہ نیند کی گولیاں سے نہ

مرتی تو ذہنی دباؤ سے مر جاتی۔

”میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں امرجہ کہ میں تمہیں پڑھنے کے لیے باہر ملک بھیج سکوں۔ شادی بھی تمہاری نہیں ہو رہی۔ میں نے تمہارے بابا

سے بات کی تو وہ الٹا مجھ پر ہنسنے لگا کہ وہ تم پر اتنے لاکھوں روپے لگا کر تمہیں پڑھنے کے لیے بھیجے کس سے اچھا ہے وہ تمہارے لیے سونے کے زیورات بنوا کر رکھ لے یا تمہارے نام کے میسینک میں رکھوا دے تاکہ

تمہاری شادی میں کام آسکیں۔

امرجہ ایسے بے زار ہوں ایسے لوگوں سے جو مقدس راتوں کو لمبی لمبی عبادتیں کرتے ہیں اور سال کے بارہ

مہینے گناہ کی مختلف حالتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ جھوٹ، حسد، بے ایمانی، غیبت سے خود کو بچانے کی

رائی برابر جودہ نہیں کرتے اور وضو کر کے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تمہاری سابقہ ساس جنہوں

نے شادی کو ختم کیا وہ مذہبی جلسوں میں احادیث کا حوالہ دے کر مذہبی تقاریر کرتی ہیں۔ میں اسی لیے

بہت مطمئن تھا کہ تمہاری شادی وہاں ہو جائے۔ پر وہ بھی وہی خوش رنگ پھل نکلیں جو اندر سے گلاسٹرا

اور بدبودار ہوتا ہے۔ ہماری یہ منافقت معاشرے کے سکون کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ ہم جو

خود کو سیدھے راستے کی طرف سمجھتے ہیں ہم انہی طرف جا رہے ہیں۔ اسے پیروں جا رہے ہیں۔

امرجہ! میرے دل کے ٹکڑے دوبارہ مرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں بھی خود کو مار ڈالوں گا۔

اپنی تعلیم کو محنت سے ذمہ داری سے حاصل کرو۔ کوئی نہ کوئی رستہ ضرور بن جائے گا۔“

دادا نے اسے بلوچستان کا ایک اور پندرہ روزہ ٹور کروایا اور جیسے تیسے اسے مناکر کالج میں داخلہ دلادیا۔

لیکن اب اس کی زندگی تھوڑی سے زیادہ تلخ ہو چکی تھی کہ اب اس کی دو مشکلیاں ٹوٹ چکی تھیں۔

خاندان سے کوئی اسے لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ماموں نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے دانیہ کا ہاتھ مانگ

لیا۔ اماں اور دادی نے خود سے امرجہ کا کہا بھی لیکن

ماموں دانیہ کے لیے ہی اصرار کرتے رہے۔

”اتنے ڈرپوک ہیں سب کہ رسک لینے کے لیے تیار ہی نہیں۔“ وہ تلخی سے دادا سے کہتی۔

”جو خدا سے دور ہوتے ہیں وہ ایسے ہی خوف زدہ ہوتے ہیں۔“

میں تو خدا سے دور نہیں پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں؟

”کبھی کبھی قدرت بے خبر سوئے پروں کے سر پر کنکر ماری ہے تاکہ وہ بیدار ہو جائیں اور اپنے مقصد حیات کی طرف لپکیں۔“

اسی دوران کچھ یہ بھی ہوا کہ جس سے اس کی منگنی ٹوٹی تھی اس کی شادی اس کی خالہ زاد ماٹہ سے ہو گئی

مزید یہ کہ اس لڑکے کی فوراً پروموشن ہو گئی اور کمپنی کی طرف سے اسے ایک بہترین گھریلو شادی کا تحفہ یورپ کا ایک ماہ کانورس مائرہ نے ایک دن اسے فون کیا۔

”میں نے تو افراسیاب سے کہا کہ مجھ سے شادی کر کے بچ گئے ورنہ اگر امرجہ خیر۔ چھوڑو۔ ویسے اچھے خالصے کنگلے ہو جاتے اور پتا نہیں کیا کیا ہو جاتا ان کے ساتھ۔“

وہ خاموشی سے مائرہ اور افراسیاب نامہ سنتی رہی۔ عاجز آکر مائرہ نے پوچھا۔

”کچھ تم بھی بولو۔ کچھ کہو۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ اتنا جواب ہی کافی تھا۔ کلج وہ جاتی رہی۔ دادا سے کم کم بات کرتی۔ ان سے ناراض بھی۔ سداوی اور اماں اب اسے گھر میں کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ گھر میں آگ بھڑکتی ڈاوی کے پیر میں موج آ جاتی۔ حماد کاموٹر سائیکل کا حادثہ ہو گیا یا کو دکان پر کوئی نیا نقصان اٹھاتا پڑتا۔ کوئی کچھ نہ کہتا کیونکہ اب یہ ٹھیکہ زور و شور سے دوسروں نے لے رکھا تھا۔ امرجہ کو ایسا لگتا کہ تاریکی کا گہرا جنگل ہے جس میں وہ بھٹکتی پھر رہی ہے لیکن روشنی کی کرن ہے کہ آکر نہیں دے رہی۔ اسے لگتا کہ دنیا سب کچھ بھول جائے گی لیکن اس کے متعلق کچھ نہیں بھولے گی۔ وہ دعا کرتی کہ کاش کوئی ہوا چلے اور سب کے ذہنوں سے اس کا نام مٹا ڈالے۔ نہ کسی کو اس کا نام یاد رہے نہ اس نام کی شخصیت سے جڑے واقعات۔ گھر میں مہمان آتے تو وہ لاجبیری چلی جاتی۔ وہاں بھی شام تک ہی رہ سکتی تھی۔ پھر دادا اسے لیے لیے گھومتے پھرتے وہ دادا سے بات نہ کرتی مگر ان کے ساتھ ساتھ گھومتی رہتی۔ دادا جانتے تھے وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے خوفزدہ رہتی ہے خاص کر رشتہ داروں اور جاننے والوں کا۔ اور یہ خوف ان ہی لوگوں نے اس کے اندر پیدا کیا تھا۔

وہ خاندان کی تقریبات اور گھر میں کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی پھر بھی وہ ان سب میں بے حد مقبول

تھی۔ وہ ڈسکس کیے جانے کے لیے قہقہے دھندلے کے لیے ایک بہترین موضوع تھی۔ سانپ بیڑی کھلا ڈی جسے بار بار سانپ کھا لیتا ہے اور اس کی دم سے ٹکٹا وہ سب سے پچھلے درجوں میں آ جاتا ہے۔ بار بار۔ امرجہ جیسی خوب صورت لڑکی کو بار بار پچھلے درجوں میں دیکھنا خاندان کی حاسد لڑکیوں کا پسندیدہ مشغلہ بھی تھا اور وہ حاسد لڑکیاں ہی کیا۔ کون ہے جو اپنے لیے پہلا نمبر اور دوسروں کے لیے آخری نمبر پسند نہیں کرتا۔

لیکن انسان تو وہی ہے ناجو اپنی خود نمائی بے شک کرتا پھرے لیکن دوسرے کی خانی کی پردہ پوشی ہر حال میں کرے۔

اور ایسے انسان اب انسانوں کے ڈھیر میں گم ملتے ہیں۔



اپنے آپ سے تلخ اپنے ماحول سے غمگین امرجہ دن بدن بو جھل اور بے زار رہنے لگی۔ نہ معلوم یہ قدرت کا طریقہ کار تھا یا قدرت کی ترغیب کہ اپنے اس بدتر ہوتے ماحول سے نکلنے کے لیے اس نے کوشش تیز کر دی۔ ڈیڑھ سال کے دوران اس نے مختلف بیرونی کلج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالرشپ فارم بھرے۔ ففٹی پرنسٹن سکسٹی پرنسٹن سیونی پرنسٹن اس نے کسی یونیورسٹی کے کسی بھی طرح کی اسکالرشپ کو جانے نہ دیا۔ دادا نے اس دوران بابا کو منانے کی بہت کوشش کی کہ چند لاکھ کی بات ہے بیٹی پر لگا دیں۔ پڑھ لکھ کر لوٹاؤ گی لیکن بابا کو یہ مشورہ ہی سراسر ایک مذاق لگتا۔

”بھلا پڑھنے لکھنے پر کوئی لاکھوں لگاتا ہے؟“

ماچسٹرونوورسٹی کے طلباء کی سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے پانچ اسکالرشپ دے رہی تھی۔ اسے وہاں سے بھی انکار ہو گیا۔ دو سالوں میں اس نے دو سو بار ”سوری یو آر اے گڈ اسٹوڈنٹ“ بٹ دی کلنٹ ہیلپ۔ ہسٹ آف لک۔ (ہم معذرت چاہتے ہیں آپ

اچھی طالبہ ہیں لیکن ہم آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے) جیسی میلز پڑھی تھیں پھر اس نے نفی چھوڑ دی تھی۔ لیکن ظاہر ہے انکار ناکامی کی کوئی حد بلاشبہ نہیں ہوگی لیکن انکار سننے اور ناکامی سننے والوں کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔

ماچسٹرونوورسٹی کے اس انکار نے اسے ایک بار پھر محضوں میں سر دے کر دلایا۔ اور اس نے بہت خفا ہو کر بہت جل کر ایک آخری میل انہیں ضرور کی۔

”میں ہوں ہی منحوس ماری۔ میں جل کر مرجاؤں تو ہی اچھا ہے۔ بھاڑ میں جاؤ تم سب اور تمہاری اسکالرشپ آفر۔“

اگلے ہی دن اسے ایک لمبی میل موصول ہوئی جس میں انتھک کوشش کرنے اور بھی نہ ہار ماننے پر ایک بڑا سا لیکچر تھا۔ ساتھ ہی دنیا بھر کے ان کامیاب انسانوں کی مثالیں تھیں مجنہوں نے بدترین حالات میں شاندار کامیابیوں کی بنیاد رکھی تھی۔ ان میں سرفہرست نام محمد علی کلمے اور چارلی چپلن کا تھا۔ ساتھ ہی اسے بہت نرم انداز سے بتایا گیا تھا کہ میٹرک میں اس کا بی گریڈ ہے ایف ایس سی میں صرف اے اور گریجویشن بھی بہت مشکل ہے کہ وہ اے پلس کے ساتھ کر لے۔ ایسی صورت میں جبکہ اس کے پاس شاندار اکیڈمک رزلٹ نہیں ہے، وہ کیسے اسے دوسرے شاندار تعلیمی قابلیت رکھنے والوں کے مقابلے میں اسکالرشپ دے دیں۔ یہ تو سراسر نا انصافی ہوگی۔

”او نہ! آئے بڑے انصاف کے علم بردار۔“

آخر میں ایک چھوٹی سی سطر لکھی تھی۔ جو کچھ یوں تھی۔

”پھر بھی ہم سب سوچ رہے ہیں شاید آپ کے لیے کچھ کر سکیں۔ ہمیں وقت دیں۔“

اس نے وقت دے دیا۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس دوران اس کا بی اے کارڈ لٹ بھی آ گیا۔ اے پلس تو جیسے بورڈ والوں نے اس پر حرام ہی کر دیا تھا کہ جس کی بھی محنت کر لے امرجہ کو اے پلس نہیں دیتا۔ وہ بہت خفا خفا سی رہی اپنے رزلٹ سے لیکن کیا کر سکتی

تھی صرف اتنا کہ ”اے پلس کا سائن صفائی سے لگا کر اپنی ڈگری ماچسٹریل کر دی۔ اور اس کی ذرا سی چالاکی کام کر گئی۔ پورا ایک مہینہ سوچنے کے بعد انہوں نے اسے کہا۔“

”ہم آپ کو سیونی پرنسٹن اسکالرشپ آفر کر رہے ہیں۔ وہ بھی تیس فیصد ہر حال میں دو سالہ ڈگری کے دوران واپس کرنا ہو گا۔ باقی کا پچاس فیصد آئندہ آنے والے پانچ سالوں کے دوران۔ اپنی رہائش فوڈ آپ کو خود ہینڈل کرنا ہو گا۔ ہم صرف عارضی طور پر یہ سب مہیا کریں گے۔“

تو منحوس ماری اور جل جل مری کی الفاظ کام کر گئے۔ انگریز نمائندگستالی لڑتا ہے اور اسے اسکالرشپ آفر کر دیا۔

دادا کے ساتھ جا کر چپکے سے اس نے اپنا پاسپورٹ بنوا لیا۔ کچھ دادا کے اپنے اور کچھ دادا نے اپنے دوستوں سے قرض لیا اور باقی کا تیس فیصد جمع کر کے اس کے ہاتھ میں دیا۔

اب وہ دادا سے چپک چپک کر باتیں کرتی۔ ان سے لاؤ کرتی۔ کئی سالوں کی کٹی اب ختم ہوئی۔ دادا پوتی میں پھر سے خوب بننے لگی۔ اس کے انداز کچھ ایسے تھے جیسے ہمیشہ کے لیے جاری ہے۔ اور دادا کے یوں کہ وہ ڈگری لے کر آئے گی تو کافی بدل چکی ہو گی اور رونادھوتا مرنارنا بھول چکی ہوگی۔

وہ دادا کے ساتھ چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں کھانے کھاتی رہی۔ اور ہر قدم پر آس پاس ایسے نظر دوڑائی جیسے سب کو الوداع کہہ رہی ہو، ہمیشہ کے لیے۔ دادا کچھ بھانپ سے گئے۔

”امرجہ! پڑھنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ صرف پڑھنا وہاں۔ یاد رکھنا صرف پڑھنے کی آزادی دے رہا ہوں باقی فیصلوں کی نہیں۔ باقی سارے اختیارات آج بھی میرے اور تمہارے بابا کے پاس ہیں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلا دیا۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ وہاں بڑھے کی جاب کرے گی اور وہیں رہے گی پتا نہیں دادا کیا کیا سوچ رہے تھے۔ اس کو

کبھی لڑکوں میں دلچسپی نہیں رہی اور وہ لکھ کر دینے کے لیے تیار تھی کہ ہوگی بھی نہیں۔

دونوں بال پر چلنے والی بکھی میں بیٹھے تھے جس کے آگے سفید گھوڑا جاتا تھا۔ اس نے آج غور کیا تھا کہ یہ سب کتنا اچھا تھا۔ دادا کے ساتھ بیٹھنا اور جنگل کرتی روشنیوں کو دیکھنا۔ کھوئے والی قلفی کھانا اور ہاتھ کو قلفی کے نیچے رکھنا۔ کھوئے والی قلفی جب گرتی ہے تو پکھل کر پوری کی پوری گرتی ہے اور یہ ایسا صدمہ ہوتا ہے کہ کسی سلسلی سے زائل نہیں ہوتا۔ مزید پانچ دس قلفیاں کھانے کے بعد بھی بس وہی ایک گر جانے والی قلفی یاد آتی رہتی ہے۔

سیدھی روشن بڑی تاریخی سڑک پر گھوڑے کی ٹاپ نے وہ موسیقی پیدا کی جو صرف لاہور کے گھوڑے مال پر دوڑتے پیدا کیا کرتے ہیں۔ وہ ہنستے مسکراتے ان دو بچوں کی طرف گھر آئے جو عید کے تین دن عیدی جمع کرنے میں لگا دیے ہیں اور صرف اس لیے گھر سے باہر نہیں نکلتے کہ مبادا ان کے پیچھے کوئی مہمان آجائے اور ان کی عیدی ماری جائے۔ تین دن عیدی جمع کرنے والے یہ دو بچے چونے دن گھر سے نکلتے ہیں اور کیا خوب نکلتے ہیں۔

”امرحہ دو دن بعد جاری ہے۔“ کھانے کی میز پر دادا نے اعلان کیا۔

”کہاں۔“ دادی نے پوچھا۔ وہ سمجھیں۔ اکثر بلوچستان جاتی رہتی ہے اب کے شاید پشاور کو نکل جائے اپنے دادا کے ساتھ۔

”ماچھڑ۔“

”وہ کیا ہے۔“

دونوں نے اپنی طرف سے دھماکا کیا تھا وہ پناہ بھی نہ لگلا۔ نظر اندازی جانی چاہیے تھی ان سب کی جغرافیائی معلومات کی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ماچھڑ شہر کا نام ہے اور یہ شہر طانیہ میں ہے۔

”کوئی رشتہ آیا ہے امرحہ کا وہاں سے۔“ اس اگلے

سوال پر دادا خاموش ہی ہو گئے۔

”تمہاری بیٹی اتنی قابل ہے کہ ماچھڑ کے پرنسپل خود خط لکھ کر اسے بلایا ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں آکر پڑھو۔“ دادا نے طنز کیا۔

بھلے سے وائٹ ہاؤس سے خط آتا کہ اوباما کی اسٹینٹ بنو آکر کوئی فرق کب پڑنے والا تھا۔ سب آرام سے کھانا کھاتے رہے۔

”امرحہ باہر جاری ہے پڑھنے۔ دو دن بعد فلائٹ ہے اس کی۔“

اب فرق پڑا۔ اماں، بابا، دادی نے حیرت سے دادا کو دیکھا۔

”میسے کہاں سے آئے۔“ بابا غصہ دیا کر بولے۔

”مفت جاری ہے۔ سارا خرچہ یونیورسٹی نے کیا ہے۔“

”بابا! کیوں پاگل بنا رہے ہیں مجھے۔ آج کل کون مفت میں سب کرتا ہے۔ آپ نے اپنا پلاٹ تو نہیں بیچ دیا۔ وہ میں نے امرحہ اور دائیہ کی شادی کے لیے رکھا تھا۔“

پلاٹ کو بیچنے کی کوشش تو دادا نے بہت کی تھی پر وہ ایسی اجازت جگہ پر واقع تھا کہ بکسی نہیں رہا تھا۔

”پلاٹ جہاں تھا اب بھی وہیں ہے۔ جا کر دیکھ آنا۔“

”کیس نہیں آنا جانا۔ رشتہ دیکھا ہے اس کا ایک بس شادی ہوگی اس کی۔“

”رشتہ۔“ امرحہ نے دادی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کمرے میں آگئی اور جلدی جلدی اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خود کو چھکی دے کر نکلتی جاتی۔

”مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ میں چلی جاؤں گی۔ میں چلی جاؤں گی۔“

دادی، اماں، بابا میں باہر بھڑک رہی تھی۔ یہ کون سا رشتہ تھا جو اس بڑے وقت میں اس کے لیے آیا تھا۔ اب اس کا جی چاہا بلکہ اس نے دعا کی کہ اس کے بارے میں جو جو کچھ مشہور ہے وہ سب ان رشتے

تک پہنچ جائیں۔ اس کے خاندان والے انہیں فون کر کر کے بتائیں کہ لڑکی کیسی جنم جلی ہے۔ منجوس ہے۔ کالی نظر ہے۔ کالی زبان والی ہے۔ اور نہیں تو کوئی دادی کی زبانی تیار کر دے اس کا پیدا انہی خلاصہ ان تک پہنچا دے کہ منگل کی دو کو کیا کیا ہوا تھا لفظ ایک اس کی آمد ہے۔

کوئی موقع تھا رشتے کا۔ اس کی انگلیاں گھس گئی تھیں میلز لکھ لکھ کر، آن لائن سکارپٹ فارمز بھر بھر کر اور دادی اور اماں اس کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔

وہ خود کو تھپکتی رہی اور کہتی رہی ”میں چلی جاؤں گی۔ میں برسوں جاری ہوں۔ کچھ نہیں ہو گا۔ دادا سب ٹھیک کر لیں گے۔“ کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی سامان بھی پیک کرتی رہی۔ پاسپورٹ کو حفاظت سے چھپا دیا کہ بابا غصے میں آکر اس کا پاسپورٹ ہی نہ جلا دیں۔

رات گزرتی رہی باہر سے ہنوز چاروں کی تیز آوازیں آتی رہیں اور پاسپورٹ کو چھپانے کے بعد وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ لگی زمین پر بیٹھی کر اٹھنے لگی لیکن ساتھ ساتھ بریڈ پاتی رہی۔

”میں چلی جاؤں گی۔ میں تو جاری ہوں۔“

دادا نے دروازہ کھولا تو اسے دروازے پر ہی اوگھتے پایا اور اس کی بریڈ پٹ کو کم زیادہ ہوتے سنا۔

تکیہ لا کر اس کے سر کے نیچے رکھا۔ زندگی میں وہ پہلی رات اتنی خوش تھی اور اس خوشی کی اسے اتنی فکر تھی کہ وہ بہا بستر کے فرش پر سو گئی تھی۔ انہیں

دکھ ہوا۔ اس ماحول نے اسے اتنے دکھ نہ دیے ہوتے۔ اس گھر میں اس کی ایسی حیثیت نہ ہوتی تو وہ ہر رات ایسے ہی سوئی۔ رو رو کر آنکھیں سرخ کیے

خوفزدہ غیند نہیں بلکہ آنکھیں موند کر پریوں کا انتظار کرنے والی نیند۔ دادا اس کے پاس ہی بیٹھ گئے اور اسے دیکھتے ہی رہے۔ اولاد نامی جس طوطے میں

والدین کی جان ہوتی ہے وہ طوطا امرحہ تھی ان کے لیے

انہیں اتنا پیار امرحہ کے والد سے بھی نہیں تھا باقی کی اولادوں سے بھی نہیں تھا۔ ایک دن امرحہ ان سے خائف ہو کر پوچھنے لگی۔

”آپ بھی دوسروں کی طرح ہو جائیں نا۔ کیوں کرتے ہیں مجھ سے پیار۔“

وہ اس بات کا جواب نہیں دے سکے۔ قدرت ہمیشہ انسان پر اتنی مہربان ضرور رہتی ہے کہ اگر ساری دنیا اس انسان سے نفرت کرنے لگتی ہے تو کوئی ایک

ضرور اس پر جان چھڑکتا ہے۔ وہ انسان کوئی بھی ہو سکتا ہے اور کوئی چرند پرند یا دوسری مخلوق بھی۔ بلاوجہ کی

نفرت ضرور ایک بلاوجہ کی محبت کو ساتھ باندھ لاتی ہے۔ جیسے جیسے دوسروں کے لیے وہ ناپسندیدہ ہوتی گئی

ان کے لیے پسندیدہ ترین ہوتی گئی۔ خدا بھی بھلا کبھی یہ بھولا ہے کہ اس کے بندے کے آس پاس

بہت کانٹے لگ آئے ہیں۔ اور اب اسے ایک ٹھیکے ہوئے ہمیشہ تروتازہ رہنے والے پھول کی اشد ضرورت

ہے۔ تاکہ اس پھول کو پکار دے کانٹوں کی دی اذیت کو فراموش کر دے۔ دادا کیا جان سکتے تھے یہ تو خدا ہی

جان سکتا تھا اور جو بہتر جان سکتا ہے وہی بہترین کر سکتا ہے۔ بے شک۔ بابا نے اسے دس ہزار روپے

دیے کہ وہ ضروری خریداری کر لے۔ اماں اور دادی کا مزاج البتہ بہت برہم تھا۔ دادا کے ساتھ جا کر ہی

اس نے ضروری خریداری کی۔ دائیہ نے اس کا سامان پیک کروایا۔ حماد اور علی دل مسوس کر اسے

دیکھتے رہے۔ آخر وہ اتنی دور جاری تھی۔ دادا مسلسل دو دن سے اپنی آنکھوں کی جھڑی چھپا رہے تھے۔

”یہ پڑھنے جاری ہے بھاگ نہیں رہی۔ ماں باپ تو خوش ہوتے نہیں۔ تم دونوں اسے رخصت کر

دو خوشی سے یہ نہ ہو کہ جہاز کریش ہوئے یا یہ لاپتا ہو جائے۔

دادا نے یہ چھوٹا سا لکچر دادی اور اماں کو دیا تھا۔ اس کا جہاز کریش نہ ہو جائے یا وہ لاپتا نہ ہو جائے۔ دونوں نے اپنی برہمی کو ایک طرف رکھا اور اسے

دعاؤں میں الوداع کہا۔
وہ مائچسٹر کے لیے روانہ ہو گئی۔
شہر اسباق کے لیے۔
شہر آزاد کے لیے۔
شہر یارم کے لیے۔

وہ برطانیہ کے تیسرے مصروف ترین ایئرپورٹ کی
اوپرچی جھست تلے ایڑی کے بل گھوم گھوم گئی۔
"میں مائچسٹر آگئی ہوں آگ لگائے۔"

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چلا کر کہا۔ چند لوگوں
نے اسے حیرت سے دیکھا۔ لیکن اسے پروا نہیں
تھی۔ وہ گھیردار سفید شلوار اور گول دامن قمیص میں
ملبوس تھی۔ اس کا سفید لمبا دوپٹہ مائچسٹر ایئرپورٹ کی
صفائی کر رہا تھا اور خاص کر ہر آنے جانے والے کے
سامان کے ساتھ الجھ رہا تھا۔ اس نے پھر سے
دونوں بازو پھیلا کر ایڑی کے بل گھوم کر کہا۔
میں آگئی مائچسٹر۔ میں اب کبھی نہیں روؤں گی
اور تم مجھے کبھی نہ رلاتا۔

برصغیر کے حاکم وقت کی سرزمین پر گھوم گھوم کر
اس کا سفید دوپٹہ لہراتا بہت خوش کن لگ رہا تھا۔
خوش بختری کا اگر کوئی اشارہ تھا تو وہ اس وقت امرجہ کا ہی
نعرہ تھا۔ مسرت و شادمانی کا اگر کوئی نقارہ تھا تو وہ یہی۔
یہی۔ ایڑی کے بل گھوم گھوم جانا تھا۔
سکون و راحت کے دریا کا اگر کوئی کنارہ تھا تو بس
۔۔۔ وہ امرجہ کا وجود سارا تھا۔

اس کو کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ وہ تین گھنٹے سے انتظار کر
رہی تھی لیکن اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ تین دن بھی
انتظار کر سکتی تھی۔ اب اسے کبھی کوئی مسئلہ نہیں
تھا۔

اسے اپنے نام کا بورڈ دور سے آتا ہوا نظر آیا۔
لاٹک کر اس بیگ لٹکائے ایک چائینز کلس کورین لڑکی
بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔

"میں ہوں امرجہ۔" وہ لپک کر اس کورین لڑکی کی

طرف لپکی۔
"اوہ ہیلو۔ سوری مجھے دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں چلیں۔"

"دراصل جسے تمہیں لینے آنا تھا۔ اس کا
ایکسیڈنٹ ہو گیا آتے ہوئے۔ پھر مجھے آنا پڑا۔
۔۔۔ زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔"

امرجہ کی شکل بنی پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔ ہانا آگے
آگے چلنے لگی وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ امرجہ
کے لیے اس کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں
ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ بلڈنگ تک آئیں۔ سالن
اوپر لائیں اور فلیٹ کے اندر آ گئیں۔

فلیٹ خالی تھا۔ دو کمرے سامنے۔ چھوٹا سا
لاؤنج اور لاؤنج کے سامنے ہی اوپن کچن۔ امرجہ کی
آنکھیں کھل گئیں۔ ایسا صاف ستھرا فلیٹ اس کے
لیسے واؤ۔

ہانا اسے ایک کمرے میں لے آئی جہاں دو سنگل
بیڈ رکھے تھے اور نہ جانے کیسے جگہ نکال کر فرش پر
ایک فولڈنگ میٹریس بچھایا گیا تھا۔ جہاں میٹریس بچھا
تھا یقیناً "وہ ان کے چلنے پھرنے کی چند قدی جگہ ہوئی

۔۔۔" یہ آپ کا بستر ہے۔" اس نے فرش پر بستر کی
طرف اشارہ کیا۔ اور امرجہ کا موڈ ہی آف ہو گیا۔ وہ
کیوں سوئے نیچے۔

"برائے مہربانی اس کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ مت
لگائیے گا۔" یہ فقرہ اس نے جبراً مسکرا کر لیکن بہت
درخواست گزار انداز میں کہا اور کیونکہ ہاف چائینز تھی
تو ذرا ساجھ کر کہا۔

جب تک وہ فریش ہوئی۔ ہانا نے اسے کافی اور
سینڈویچز بنا دیے۔ "یہ میری طرف سے۔" چھوٹی سی
ٹری کو آگے کرتے ہوئے اس نے عاجزی اور ایسی
خوشی سے کہا جیسے اپنی قیمتی خزانے میں سے اسے کچھ
عنایت کر رہی ہو۔ امرجہ دیکھ کر رہ گئی۔ اتنی لمبی
فلائٹ کے بعد اسے یہ چھوٹا سا خوان پیش کیا جا رہا
تھا۔

"شاید یہ ابتداء ہی ہو اور اصلی سوپر (کھانا) رات میں
ہو۔" امرجہ سوچنے لگی۔

"میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ مجھے جانا ہے۔" اور
جاتے جاتے بھی وہ پھر کہہ گئی۔ "کسی بھی چیز کو ہاتھ
مت لگائیے گا پلیز۔"

لیکن وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتی رہی۔ اسٹڈی
ٹیبل پر رکھے نئی نئی اشکال والے پرفیومز کو اس پرے کرتی
رہی۔ دراصل وہ صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ وہ کس
قدر اصلی ہیں۔ یعنی کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاکستان
میں کتنا بھی منگا اور ہائی برانڈ کا پرفیوم لے لیا جائے وہ
اصل کی کاپی ہی ہوتا ہے اصل نہیں۔ سب کے
پرفیومز بے دریغ اس پرے کرتے اسے کچھ کچھ حقیقت کا
اندازہ ہو رہا تھا کہ پاکستان میں وہ اصل کی کاپی ہی
خریدتی رہی ہے۔ پورا فلیٹ معطر ہو گیا اتنے ہائی
کوالٹی پرفیومز سے۔ وہ۔ وہیں قریب ہی کچھ میک
اپ کا سامان رکھا تھا وہ اسے دیکھتی رہی۔ کتابوں پر
صرف ایک نظر ڈالی ایسے ایسے ٹائٹل تھے کتابوں کے
جیسے عمدہ قدیم کی کتابیں عمدہ جدید کے لباس میں ملبوس
پڑی ہو۔

عمدہ قدیم سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔
واش روم گئی۔ ایک ایک آئینہ کو چیک کیا، میس
واش، پاؤی واش۔ لوشنز کو دیکھا۔ حتیٰ کہ ہاتھ
نب کے کنارے پر رکھی چھوٹی چھوٹی بطخوں کو بھی۔
پھر وہ کچن میں آئی۔ ایک ایک کینٹ کو کھول کر
دیکھا۔ فوڈ آئٹمز کو سوکھ کر دیکھا۔ دوسرا کمرہ الاک
تھا۔ لاؤنج میں رکھائی دی اس نے آن کیا اور پہلے
چینل چیک کرتی رہی پھر ایک میوزک چینل لگا کر کچن
میں آ کر نوڈلز بنانے لگی۔ دو عدد نوڈلز کے پیکٹ
بنائے۔ بڑے پالے نما باؤل میں ڈالے۔ اور
ایڈورڈ مایا کو سننے سننے کھا گئی۔ باؤل کو میز پر ہی رہنے دیا
اور پی وی بند کر کے سنگل بیڈ پر آکر سو گئی۔

"تمیں فیصد ادا کیا تھا انہیں۔ کوئی مذاق تھا۔"
رات کو بارہ کے بعد کا وقت ہو گا جب اسے اٹھایا جا رہا
تھا۔

"مس پاکستان۔ پلیز انٹریس۔" ایک نیا چہرہ اسے
اٹھا رہا تھا۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ یہ خواب ہے سو وہ بدستور
سوئی رہی۔

"لیڈی امرجہ۔ پلیز۔ ورنہ میں آپ کی ٹاک
کے پاس یہ ڈی ڈی اسپرے کروں گی۔ اینڈ ٹرسٹ
می! اس کی اسمیل دنیا کی گندی ترین اسمیل ہے۔
کئی ہفتوں تک ٹاک میں ٹھہری رہتی ہے۔"

امرجہ تو خواب میں دادا کے ساتھ بیٹھی ہماری کھا
رہی تھی۔
اسپرے کا ڈسکن کھلا اور دنیا کی گندی ترین ہڈیرو اس
کی ٹاک کے قریب آئی۔ وہ سچ کہہ رہی تھی وہ کئی
ہفتوں نہیں جانے والی تھی۔

"دادا۔" وہ چلا کر اٹھ بیٹھی۔
"ابھی میں نے اسپرے نہیں کیا۔" اس نے
کندھے اچکا کر اسپرے کی بوتل پر ڈسکن رکھا۔
وہ اپنی سرخ بو جھل آنکھوں سے گہری سبز آنکھوں
والی کو پچھاننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی نظر
دھندلا رہی تھی۔

ڈی ڈی کا ڈسکن پھر سے کھلا۔ اور اس کی ٹاک
کے قریب آیا۔ اس نے ہاتھ سے پرے کیا۔ اس
بار اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔
"کتنا غیر منذب انداز ہے یہ۔" امرجہ کی آواز
رو ٹکھی ہو گئی۔ گہری سبز آنکھیں پھیل گئیں۔
"غیر منذب۔"

"تم لوگ کتنی بھی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھ لو
بنیادی اخلاقی اصول بھی نہیں سیکھ سکو گے۔"
اس بار سبز آنکھیں طنز سے اسے دیکھنے
لگیں۔ "ذرا صبر کے ساتھ باہر آجائیے۔" وہ کہہ کر
چلی گئی۔

امرجہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ اس نے جان بوجھ کر
زیادہ وقت لگایا کہ کب رتی رہیں کھانے پر اس کا
انتظار۔ لیکن باہر لاؤنج میں کوئی کھانے دانے کی میز
بچی تھی نہ ہی کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو میں آ رہی
تھیں البتہ ایک نہ دو پورے پانچ کا مجمع باہر بیٹھا تھا اور

میز پر نوڈلز کا وہ باؤل رکھا تھا جس میں کچھ نوڈلز بچے تھے۔ وہ مجمع اسے دیکھ رہا تھا۔

”بیٹھ جائیے۔“ بھورے بالوں والی نے کہا جس نے ایشیائی طرز کی بالوں کی چوٹی گوندھ کر دائیں شانے کی طرف ایسے ٹکار رکھی تھی جیسے کنڈلی مارے بھورا سانپ کھڑکی کی چوکھٹ پر بڑا جھول رہا ہو۔ امرجہ بیٹھ گئی۔ شاید کھانے سے پہلے متعارف ہوتا ہوگا۔

”یہ مس پاکستان ہیں۔ امرجہ۔“ ہانانے کہا۔

”ہائے۔۔۔ میں للی کول ہوں۔ اسکاٹ لینڈ سے۔ اسپرے والی نے اپنا تعارف کروایا۔

”میں شری مارگوٹ۔“ بھورے بالوں والی نے کہا لیکن وہ مسکراتی تھی۔

”آئی ایم بیٹی لو۔ میں جرمنی سے ہوں۔“ بہت لمبی اور بہت تپتی بیٹی لونے بے طرح مسکرا کر کہا امرجہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ہنسی اس کی آمد سے ہی قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

”میں عذرا ہوں۔ شکاگو سے۔“ ٹزکھڑا اردو میں آواز آئی مروانہ ہنسر اشاکل کی حامل جسے وہ شارلٹ کرسٹینا ٹائپ سمجھ رہی تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔“ ہانانے بولنا شروع کیا۔

”میں صرف واش روم گئی تھی۔“ وہ صاف مکر گئی۔

ہانانہ کا منہ کھل گیا ”یہ جھوٹ بول رہی ہیں شری۔“ شری نے آنکھ سے اشارہ کیا ہانانہ کو۔ اور ہانانہ خاموش ہو گئی۔

”یہ۔۔۔“ شری نے میز پر رکھے باؤل کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھے کیا معلوم اس کے بارے میں۔۔۔ یہ تو پہلے سے یہاں رکھا تھا۔“ اب کی بار وہ حقیقتاً ”ڈر گئی تھی اور اسے افسوس ہوا اس نے سارے نوڈلز کھا کر باؤل کو دھو کر کول نہ رکھا۔

”ٹھیک ہے امرجہ! آپ جا کر سو جائیں۔ سواری آپ کو ڈسٹرب کیا۔“

”اور کھانا۔“ وہ کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

وہ ہانچوں پہلے اسے پھر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ بیٹی لونے کو منہ پر ہاتھ رکھ لیا لیکن امرجہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ اپنی ہنسی کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”ابھی آپ کو اور بھوک لگی ہے۔۔۔؟“ عذرا نے پوچھا۔

”نہیں بھوک تو نہیں لگی۔۔۔ پھر بھی کھانا تو کھاتے ہیں نا۔“ اس سے یہی بات بن سکی لیکن حقیقت میں اسے بھوک لگی تھی اور بھوک سے زیادہ اسے یہ انتظار تھا کہ آخر اس کے لیے کھانے کا کس قسم کا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا کیا بنا یا گیا ہے اس کے لیے۔

”ہم بنا بھوک کے کھانا نہیں کھاتے لیڈی۔“ شری نے کسی قدر متانت سے کہا۔

”کھاتے بھی نہیں؟“ اس نے اردو میں کہا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا بس عذرا نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ کمرے میں آئی اور فرشی بستر پر آکر سو گئی۔ باہر جھینساٹھ ہوتی رہی۔ ”ہوئی رہے میں فیصد ادا کیا ہے۔“ وہ سو گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ اٹھی تو کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی ”اف اتنی صفائی۔ اتنی خوب صورتی۔“

بلڈنگ کے جس راستے سے وہ اس فلیٹ میں آئی تھی یہ اس کی پچھلی طرف کا منظر تھا جہاں سرسبز گھاس کا ایک گھلا قطعہ تھا اور اس سرسبز گھاس پر جگہ جگہ مختلف کیاریوں میں ڈھیر سارے پھول کھلے تھے۔

قطعے کے پار سڑک جس پر دو دو رنگ گرو کا نشان نہ تھا۔ اتنی خاموشی جیسے کوئی نئی نوع انسان زمین پر اترا ہی نہیں۔

کمرہ خالی تھا۔ سارا فلیٹ ہی خالی تھا۔ بیڈ کورز بے شکل تھے، اسٹڈی ٹیبل پر ایک بھی پرفیوم موجود نہیں تھا۔ واش روم میں کل رات تک نظر آنے والے سب ہی شیپوز، قمیص واش عائب تھے۔ وہ چکن

میں آئی تو کاؤنٹر پر ایک چٹ رکھی تھی۔

”یو آر ریک فاسٹ۔“

انڈیا جام چار ڈنل روٹی کے پیس، دودھ اور شوگر ایک پلیٹ میں۔۔۔ کافی کے مک میں ایک مک

جستی کافی اور سائڈ پر رکھا ایک عددی بیگ۔

باقی چاروں کیبنٹ کو ایک زنجیر سے پرو کر درمیان میں چھوٹا سا تالا لگا دیا تھا۔ امرجہ کو ایک معمولی سا

جھٹکا لگا یہ سب دیکھ کر۔ بس یہی معمولی سا۔ اس کے پاس کوئی فون نہیں تھا رات ہانانے اس کی بات

پاکستان کروا دی تھی۔ اب ظاہر ہے اسے خود ہی فون کرنا ہو گا اگر وہ اس معمولی سے جھٹکے کے بارے

میں دادا سے یہی بات کرنا چاہ رہی تھی تو۔ اور لمبی بات پر لمباٹل بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔

دوسری چٹ فریق پر لگی تھی۔ ”نوبے آکر ڈبلی تمہیں لے جائے گی یونیورسٹی تیار رہنا۔“

ناشتا کر کے وہ تیار ہو گئی۔ ٹھیک نوبے ڈبلی نامی چھوٹی سی عورت نماچی کہ لڑکی آئی۔

”میں ڈبلی ہوں مجھے شری نے کہا تھا کہ تمہیں یونیورسٹی ڈراپ کرنی جاوے۔“

”میں امرجہ ہوں۔ میں آج پہلی بار یونیورسٹی جا رہی ہوں۔“

”یہ تمہیں دیکھ کر بخولی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“

وہ مسکرائی اور امرجہ کو وہ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگی،

ان لہجے امرجہ کو اس کی گھسی ہوئی جینز اور گھسے ہوئے شوز بھی بہت اچھے لگ رہے تھے اور اس کے

برسلز والے دانت بھی کیونکہ وہ مائچسٹر یونیورسٹی میں قدم رکھنے جا رہی تھی۔ اسے سب اچھا ہی لگتا

چاہے تھانا۔

”جلدی کرو ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ ڈبلی تیزی سے باہر نکلی۔ فلیٹ کو لاک کر کے وہ اس کے پیچھے

آئی۔ ڈبلی ایک منی سی سائیکل کو لیے تیار کھڑی تھی۔

”آجاؤ بیٹھ جاؤ۔“ اس نے اس منی سی سائیکل کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

تو اس پر ڈراپ کرنا تھا اسے۔ اس لیے خاص

ڈبلی کو بھیجا گیا۔

”کیا ہوا امرجہ۔ آجاؤ نا۔ مجھے اپنی کلاس بھی

لینی ہے۔“

وہ اس منی سی لڑکی کی منی سی سائیکل پر بیٹھ گئی،

پہلے اپنی شرمندگی چھپاتی رہی پھر اپنی ہنسی دیتی رہی

۔ سڑکوں پر سے گزرتے اس نے کسی طرف بھی نہ

دیکھا اور ڈبلی کے پیچھے منہ چھپائے وہ اپنی ہنسی کی رفتار

کم کرتی رہی۔

”دادا۔“ اس نے خیالوں میں دادا کو مخاطب کیا۔

”مجھے اتنی ہنسی آرہی ہے کہ میرا جی چاہتا ہے اس

سڑک پر کود جاؤں اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اتنی زور زور

سے ہنسون کہ سارا مائچسٹر اکٹھا ہو جائے۔ دادا! زندگی

کیسے کبھی ہمیں چھوٹے، معمولی، بے کار قسم کے

بہانوں پر ہنساتی ہے۔ دادا! مجھے وقت کے یہ بہانے

اچھے لگے جو اس نے میری زندگی میں پرو دیے۔“

اس دوران بار بار اس کی نظر ڈبلی کے ان چند بالوں

کی طرف اٹھ جاتی تھی جنہیں ڈبلی نے سر سے بہت

اوپر اٹھا کر جتنی منی سی پونی میں باندھ رکھا تھا۔ اور جو

خدا معاف کرے پونی ٹیل کے نام پر خاصا گہرا کٹنگ کا

ٹیکہ تھا۔ ہوا میں لہراتے وہ کسی چھوٹی چڑیا کی دم جیسے

لگ رہے تھے۔

ڈبلی سنجیدگی و متانت سے ایسے سائیکل چلا رہی

تھی جیسے شاہ اردن کی سونے کی بکھی دوڑا رہی ہو۔

سارا راستہ وہ امرجہ کی ہنسی کے فواروں کی پوچھاڑ سستی

رہی تھی۔ اسے اتارنے کے بعد وہ بولی بھی تو صرف

اتنا ”کتنی موٹی ہو تم۔“ جاگنگ کیا کرو۔“ ڈبلی کیسے

اسے اپنی سائیکل پر گھسیٹ کر وہاں تک لائی تھی اس

کی پیشانی کا پسینہ تاسکتا تھا۔

کی بنیاد 1824ء میں رکھی گئی تھی۔

علم، حکمت، انسانیت جس درگاہ کا موٹو تھا۔ جو قریباً چالیس ہزار کے قریب اسٹوڈنٹس کو فیض یاب کر رہا تھا۔ دنیا کی دس بہترین درسگاہوں میں سے ایک ”ویونیورسٹی آف سائیکسٹرو“ وہ مین کیپس کو۔ آرک کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس طرز تعمیر کی عمار میں اس نے لاہور میں بھی دیکھی تھیں۔ یہ اسے کچھ کچھ لاہور عجائب گھر جیسی بھی لگی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اندر کیسا جہان آیا ہے۔ دنیا کے کیسے لائق فائق قابل اساتذہ یہاں اکٹھے کیے ہیں۔ وہ کیسے کیسے شاگردوں کے استاد بنا دیے گئے ہیں۔ وہ ابھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ بہت جلد بہت کچھ جان جائے گی۔

اسٹوڈنٹس کا جم غفیر ایسے اندر جا رہا تھا جیسے اندر کوئی چیز مفت ہانپی جا رہی ہو جیسے کہ ”بریاٹی“ یا اٹلی کا وہ مشہور ہیزا جو اٹلی میں بھی نہیں ملتا۔

”آجاؤ امرجہ“ ڈربلی کلانی آگے جا چکی تھی۔ امرجہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے پہلے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔ یہ جدید طرز کا سائیکل اسٹینڈ بھی امرجہ کے لیے نیا تھا۔ خیر اب تو اس کے لیے بہت کچھ نیا ہونے والا تھا۔ اس کی آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف دیکھے۔ بس جی چاہ رہا تھا سب ایک ہی بار جلدی سے دیکھ لے۔ اسٹوڈنٹس کی آمدورفت میں تیزی بھی تھی اور پھرتی بھی اور وہ ایسے تھی جیسے کہ پھرتی اور تیزی سے ہم کبھی ملے نہیں اور ست روی سے ہماری بہت دوستی چل رہی ہے۔

”امرجہ! بیڑ چلو نا۔“ ڈربلی نے بیس قدم آگے جا کر گردن موڑ کر آواز لگائی۔ اس کو اوبر اس نے ذرا سی تیزی دکھائی اور اس سے چند قدم قریب ہو گئی۔ ڈربلی سر سبز گراؤنڈ میں ایک گروپ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف اشارہ کیا۔ امرجہ کا اتنی دور سے ہی ذرا دم سائل لگ گیا۔ وہ دس بارہ لڑکے لڑکیوں کا

گروپ تھا اور ان میں شری کو اس نے فوراً پہچان لیا۔ بلی عذرا کو پہچاننے میں اسے تھوڑا وقت لگا کیونکہ اس نے سر پر سیاہ مہیٹ باندھ رکھی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ان کے قریب جا کر ذرا دلی دلی آواز میں کہا اگر ڈربلی کے ساتھ اس کی سائیکل پر بیٹھے وہ ہنسنے سے ذرا جلدی فاسر ہو جاتی تو اس سے کچھ معلومات ہی لے لیتی۔

سب نے اپنا اپنا نام لے کر تعارف کروایا۔ اس دوران وہ جس غلو میں سے مسکراتے رہے۔ امرجہ ہلکی پھلکی ہوتی گئی۔ وہ بلاوجہ ان کے دباؤ میں آگئی تھی۔ یہ سب تو بہت اچھے ہیں۔

ایک لڑکا اور دو لڑکیاں انھیں اور اسے ساتھ لے کر یونیورسٹی کینٹین میں آگئیں اور اسے کافی پلائی۔ جب وہ کافی کی آخری چسکی لے چکی اور گروپ کے لیڈر دائم اور گروپ کی لڑکیوں نوال اور بریرہ کی خوب صورتی کو دل ہی دل میں داد دے چکی تو دائم نے کچھ یوں بات شروع کی۔

”مس امرجہ! کیا آپ مجھے مکمل سنجیدگی اور توجہ سے سننے کا وعدہ کریں گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ اس نے ٹھیک اسی انداز میں کہا جس میں بچے ایک ہاتھ میں چاکلیٹ چھپا کر اور دوسرے ہاتھ کو آگے کر کے کہتے ہیں۔ ”پکا وعدہ میں رات میں چاکلیٹ نہیں کھاؤں گا۔“

”گڈ۔ کیونکہ مجھے کچھ شک سا ہے اس لیے پھر کہہ رہا ہوں کہ درمیان میں مت بولے گا۔ ہم یہ تین لوگ جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہم نے اور کچھ ان دوستوں نے جو تعلیم مکمل کر چکے ہیں یا جو ہم سے سینیور ہیں نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ کیوں نہ ہم اپنی ذاتی کوششوں سے لائق فائق قابل پاکستانی اسٹوڈنٹس کو اسکالرشپ دیں۔ ہم انہیں اپنے جمع کیے گئے فنڈز سے یہاں بلوائیں تاکہ وہ پاکستانی اسٹوڈنٹس کو جولا لائق تو ہیں لیکن اچھی تعلیم انورڈ نہیں کر سکتے انہیں آگے بڑھنے کا اور غیر ملکی سطح پر اپنا آپ منوانے کا موقع ملے تاکہ یہ سب بھلا پاکستان کی ترقی میں

اہم ثابت ہو سکیں۔ سادہ لفظوں میں ہم بے حد ذہین لیکن بے حد غریب اسٹوڈنٹس کو یہاں بلوا رہے تھے۔ جو پاکستانی یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمارے تین لوگوں کے گروپ نے مختلف ذرائع سے فنڈز اکٹھے کیے۔ ہم نے مختلف ایونٹس میں اسٹالز لگائے، کچھ میوزک اور تھیٹر کیا۔ کچھ ہماری اپنی سیونگ تھی اور کچھ ہمیں ہمارے والدین، رشتے داروں، دوستوں اور مختلف کیونٹینز کے مختلف افراد نے فنڈز دیے۔ اور ہم نے مطلوبہ ہدف پورا کر لیا۔

ہم صرف پانچ اسٹوڈنٹس ہی انورڈ کر سکتے تھے وہ بھی اس صورت میں اگر وہ یہاں آتے ہی جلد سے جلد اپنی خوراک اور رہائش کی ذمہ داری اٹھالیتے۔ اگر ہم انہیں خوراک اور رہائش بھی دیتے تو صرف تین ہی کو یہاں بلوا سکتے تھے۔

ہمیں ایک ہزار سے زیادہ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے ہم نے پانچ کا انتخاب کیا۔ بلی کے جو ہزار اسٹوڈنٹس تھے وہ بھی کسی سے کم نہیں تھے لیکن جن پانچ کا ہم نے انتخاب کیا تھا وہ گاؤں اور بہت چھوٹے قصبوں کے رہنے والے تھے اور ان کے لیے پانچسٹرو یونیورسٹی آکر پڑھنے کے چانسز صفر تھے۔ وہ سب یہاں ایک ہفتہ پہلے ہی آچکے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آتے ہی انہوں نے اپنی رہائش اور خوراک کا انتظام کر لیا ہے کیونکہ وہ بڑھے لکھے ہونے کے ساتھ ہنرمند بھی تھے۔ اس لیے انہیں فوراً یہاں جا بل گئی۔ ان میں سے ایک گاڑیوں کے لاک ٹیک کرنا ہے اور ایس لیور کشاپ نے سیلیوٹ مار کر اسے جا بل دی ہے۔ مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ایک ایسے طالب علم کو یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس نے اپنی پرائیویٹ تعلیم میں پنجاب بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اور یہ ٹاپ اس نے گاڑیوں کے لاک ٹیک کرتے اور ایک دن بھی اپنی جا بل سے چھٹی نہ کر کے کیا۔

ہمیں بھی درخواستیں موصول ہوئیں وہ کم و بیش

سب ہی ایسی تھیں لیکن ایک آپ کی درخواست سب سے مختلف تھی۔ آپ کی تعلیمی اسٹوڈنٹس کچھ بھی قابل ذکر نہیں تھا۔ آپ ان ہزار میں سے صفر تھیں۔ آپ لاہور جیسے بڑے تعلیمی شہر میں رہتی تھیں۔ جہاں اچھے تعلیمی اداروں کی بھرمار ہے۔ آپ پڑھنے کے لیے ایک اچھے کالج جاتی تھیں۔ آپ کے فلاور کی پاکستان کے ایک بڑے بازار میں اپنی ذاتی دوکان تھی۔ آپ کے پاس اپنا ذاتی گھر تھا۔ آپ کوئی جا بل بھی نہیں کرتی تھیں پھر بھی آپ کی تعلیمی قابلیت میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں تھا۔ آپ کسی بھی طرح اس اسکالرشپ کی مستحق نہیں تھیں۔ آپ کی درخواست پر جواب بھی نہیں دیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن ہم نے جواب دیا۔ آپ کی تعلیمی قابلیت دیکھ کر ہمیں۔ آپ کی ذہنی حالت دیکھ کر۔ اپنی آخری میل میں آپ نے لکھا تھا ”میں ہوں ہی منحوس ماری میں جل کر مر جاؤں تو ہی اچھا ہے۔“ اس سطر پر ہم نے ذرا توجہ دی۔

ہماری ایک گروپ ممبر نے جو نفسیات کی طالبہ ہیں آپ کی عجیبی گئی دوسری میلز بھی پڑھیں اور اس نے اپنی رائے دی کہ آپ کی ذہنی حالت بہت تباہ کن ہے اتنی ناکامیاں اٹھانے کے بعد مزید ناکامی آپ کو بالکل توڑ دے گی اور مایوس ہو کر آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں اس لیے ہم نے ایک مہینے کا وقت لیا آپ سے۔ ہم اس صورتحال پر حقیقتاً ”کافی پریشان“ تھے ہم اپنے اسکالرشپ دے چکے تھے۔ آپ کو کیا دیتے۔ لیکن آپ کو اس کیفیت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اس لیے اس بار ہم نے اپنی پاکٹ مٹی نکالی۔ کچھ دوسرے اسٹوڈنٹس سے رابطے کیے۔ اور پھر سے چالیس اسٹوڈنٹس نے آپ کے لیے فنڈز اکٹھے کیے۔ اور بہت مشکل سے۔ اتنی مشکل سے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ان چالیس اسٹوڈنٹس میں عیسائی، مسلم، انڈین، بنگالی، چلیائی، امریکن، فرینچ سب شامل ہیں۔ اس لیے یہاں خاص طور پر میں آپ کو یہ ذہن نشین کروا دوں کہ ان افراد کی اقوام کا احترام

آپ پر لازم ہے۔

ہم نے آپ سے پوچھا۔ کیا آپ لفٹ پر سٹنٹ
انورڈ کر سکتی ہیں؟ آپ نے کہا نہیں۔ مجھے یقین ہے
کہ اس لفٹ پر سٹنٹ کے لیے آپ نے اتنی کوشش
نہیں کی ہوگی جتنی ہم آپ کے لیے کر رہے تھے۔
لیکن آپ تھری پر سٹنٹ اولی پر مان گئیں۔ اگر آپ
تھری پر سٹنٹ پر نہ مانتیں تو آپ کے لیے مجھے اپنی وہ
کار چینی پڑتی جو میں نے کالج کے زمانے میں اپنی پارٹ
ٹائم جاب کی سیونگ سے خریدی تھی۔ یہ بات
اچھی طرح یاد رکھیے گا کہ جن چالیس اسٹوڈنٹس نے
آپ کے لیے فنڈز دیے ہیں وہ بہت امیر کبیر نہیں ہیں
۔۔۔ سب پڑھنے کے ساتھ جاب کرتے ہیں اور ایک
ایک اپنی بچاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ
آپ ہوا میں اڑ کر یا جادو سے یہاں نہیں آئیں۔ ہر
روز ہم نے آپ کے لیے میٹنگ کی ہے۔ صورت حال
پر غور کیا ہے۔ کوئی ایک بھی ہاں کر کے پیچھے نہیں
ہوا۔ کمائے گئے اور بچائے گئے ایک ایک پونڈ کو
انہوں نے آپ پر انویسٹ کیا ہے۔ انویسٹمنٹ کرنا
سمجھتی ہیں آپ۔ انویسٹمنٹ اس لیے کی جاتی ہے
کہ پیسے لگانے والے کو نفع ہو۔ اور یہ فائدہ وہ اس
طرح لے رہی ہیں تیسری دنیا کا ایک باشندہ تعلیم یافتہ ہو
جائے وہ اپنے ملک و قوم کا سہارا بنے۔ انہیں آپ
ان کے لیے گئے پورے پورے پیسے واپس کریں گی۔
ایک کم نہ ایک پونڈ زیادہ۔ اور سارا منافع آپ کے
جائیں گی۔ اس سارے منافع یا فائدے کے لیے
انہوں نے انویسٹمنٹ کی ہے۔ میری بات کو برائے
مہربانی سمجھیں اور یاد تو ضرور ہی رکھیں۔

جنہوں نے فنڈز دیے ہیں وہ آپ کو نہیں جانتے۔
کوئی ایک بھی آپ کا نام نہیں جانتا۔ شکل سے تو
بالکل بھی نہیں۔ مگر آپ کی عزت نفس مجروح نہ
ہو۔ ہم تین کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ فنڈز آپ
کے لیے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ ہم نے آپ کی عزت
نفس کا پورا خیال رکھا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ
کوئی آپ کے پاس آکر آپ کو کچھ بھی جتائے۔ اب

میں دوسری طرف آتا ہوں۔

آپ سے کہا گیا کہ اپنی رہائش اور کھانے کا ذمہ
آپ کو لینا ہو گا۔ آپ نے کہا آپ یہاں آکر دیکھ لیں
گی۔ گڈ۔ صرف یہی ایک اچھی اور مثبت بات
تھی جو آپ نے کی تھی۔ جن پانچ لڑکیوں کے ساتھ
آپ رہیں۔ ان سے ہم نے خاص درخواست کی تھی
کہ وہ آپ کو عارضی طور پر چند دن اپنے پاس رکھ لیں
۔۔۔ آپ کو ایر پورٹ ریسیو کرنے کے لیے جانے والے
جس شخص کا انکسپنڈنٹ ہوا وہ ہمارے لیے رضا کار
بناتھا جو آپ کو ایر پورٹ سے لے کر گئی وہ اپنے اس
دوست کے لیے آپ کی مدد کر رہی تھی جس کا
انکسپنڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس بستر پر کل آپ سوئیں
وہ میٹرس ان دونوں نے۔

اس نے نوال اور بریرہ کی طرف اشارہ کیا۔
”اپنی باقی ماندہ بچی ہوئی سیونگ سے خرید کر وہاں
رکھا۔ آپ کو ہانا نے منع کیا تھا کہ کسی چیز کو ہاتھ
نہیں لگانا لیکن آپ نے لگایا پرفومز کو اور ایسی ہی
دوسری چیزوں کو۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ سوائے
کتاؤں کے ہر چیز کو۔ آپ نے دو نوڈلز کے پیکٹ نکال
کر کھائے۔ مس امرجہ وہ سب بہت اچھی میزبان
ہیں۔ ان لیکٹ ہم سب جانتے ہیں کہ میزبانی کے
کوتے ہیں لیکن ہم سب اور وہ سب اپنے گھروں میں
نہیں ہیں۔ ہم اپنے گھروں، شہروں، ملکوں سے دور
یہاں اکیلے رہ رہے ہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت۔
کاش رات ہی ہانا تھوڑا سا آپ کو اپنے بارے میں
بتا دیتی۔ وہ صرف دو وقت کھاتی ہے۔ صبح وہ نوڈلز کا
پیکٹ کھاتی ہے اور رات کو جہاں وہ جاب کرتی ہے
وہیں سے اسے ایک برگر ملتا ہے اور ایک کپ کلاں۔
وہ ایک ایک پونڈ بچاتی ہے کیونکہ اپنے تعلیمی
اخراجات وہ خود ہی اٹھا رہی ہے۔ کوریا میں رہنے
والے اس کے گھر والے اسے اخراجات کے نام پر
ایک پاکستانی روپیہ بھی نہیں بھیج سکتے۔ اس نے تن
تھا ماچسٹر میں بسنے پڑھنے کا خواب پورا کیا ہے۔
شاید یہ باتیں آپ کو معمولی لگیں۔ آپ جو لاہور

کے تعلیمی اداروں میں پڑھتی ہیں اور جن کی فیس
والدین ادا کرتے ہیں۔ آپ جنہوں نے بھی کوئی
جاب نہیں کی۔ نہ آپ کو جاب کی ضرورت پیش
آئی ہے۔ آپ کو یہ سب معمولی لگے گا کیونکہ آپ
نے بھی زندگی میں سخت جدوجہد نہیں کی وہ بھی مسکرا
کر حوصلے سے۔ یہاں بہت سے ایسے اسٹوڈنٹس
ہیں جو زیادہ کھانا نہیں کھاتے کیونکہ انہیں زیادہ کتابیں
خریدنی ہوتی ہیں۔ وہ ایک جینز ڈوئی شئرس میں یہاں
سے اپنی ڈگری لے جاتے ہیں۔ اور مسکراتے ہوئے
آتے ہیں مسکراتے ہوئے ہی جاتے ہیں۔ شری
جن کے فلیٹ پر آپ رہ رہی ہیں گن کے ساتھ رہنے
کے لیے آپ کے پاس زیادہ سے زیادہ آج کی رات ہے
۔۔۔ فائنل ڈیڈ لائن ٹھیک ایک مہینے کی ہے۔ آپ
کے ایک مہینے کے کھانے کا سامان وہاں موجود ہے۔
آپ آج ہی اپنی رہائش اور جاب کا انتظام کر لیں۔ وہ
رکا۔

”ویلم ٹوماچسٹر مس امرجہ۔“ اس نے سانس
بھی نہیں لیا اور پھر سے شروع ہو گیا۔
”یہ تو ہو گئیں آپ کے یہاں رہنے کے بارے میں
کچھ تفصیلات۔ اب آپ کو میں کچھ تجاویز دیتا ہوں
۔۔۔ یعنی اچھی باتیں۔ مسکرایا۔

”برا مت مانجیے گا لیکن یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ
پاکستان، انڈیا، سری لنکا اور ایسے ہی دوسرے ترقی پذیر
ممالک سے آنے والے بہت شکایتی ہوتے ہیں۔
ست کاٹل۔ بہانے باز۔ انہیں لگتا ہے بلکہ انہیں
یقین ہوتا ہے کہ سب مشکلیں، پیچیدگیاں دکھ ان ہی کو
مل گئے ہیں۔ رونے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔
آپ کی شکل بھی کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ روئیں لیکن
بہت بڑے دکھ پر تکلیف پر۔ لیکن مشکل پر نہیں
۔۔۔ یہاں آپ کو کوئی چپ نہیں کروائے گا۔ اس
لیے نہیں کہ یہاں سب خود غرض ہیں جیسا کہ یہاں
کے لوگوں کے بارے میں سوچا اور کہا جاتا ہے۔ بلکہ
اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رونے بے وقوفی ہے۔ میں
بھی یہی سمجھتا ہوں۔ نوال اور بریرہ بھی یہی سمجھتی ہیں

۔۔۔ اگر چھوٹی بڑی مشکلات پر رونے والے کو بار بار
چپ کر دیا تو وہ بزدل بن جائے گا بہادر نہیں۔
مس امرجہ! اپنی سستی اور کلاں کو ہلانے بازی کو
یہاں وہاں کوئی ڈسٹ بن دیکھ کر اس میں ڈال دیں یا
آگ لگا دیں۔ اصل جل مرنا تو انہیں چاہیے۔
آپ لڑکی ہیں لیکن کمزور نہیں ہیں۔ ہمارے مذہب
نے کہاں لڑکی کو کمزور کہا ہے۔ کہتے ہیں مرد رویا
نہیں کرتے۔ لیکن یہ کہنا مرد کے لیے ہی کیوں ہے؟
عورت کے لیے کیوں نہیں یا مرد کے ہاتھوں بنا
معاشرہ یہ مقولہ کہلواتا ہے تاکہ عورت کو ہر سطر پر کمزور
ثابت کیا جاسکے۔

مس امرجہ! آپ ماچسٹر یونیورسٹی آچکی ہیں۔
آپ دوڑ میں شامل ہو چکی ہیں۔ یا تو گولڈ میڈل لیں
۔۔۔ ورنہ دوڑ سے الگ ہو جائیں اور جا کر تماشائیوں
میں بیٹھ جائیں اور یاد رکھیں! تماشائیوں کی بھیٹر میں
آپ کو فوراً جگہ مل جائے گی۔ دوڑ میں آپ اگر
صرف انجوائے منٹ کے لیے آئی ہیں تو آخری میسر
میں آنے سے بہتر ہے کہ آپ دوڑ سے نکل کر کسی اور
کو آگے آنے دیں۔ میرا یقین کریں دنیا میں
جو ہریوں کی کمی تو یقیناً ہوگی لیکن ہیروں کی کمی
صورت نہیں۔“

اس بار وہ رکا اور کافی دیر تک رکا ہی رہا۔
”یونیورسٹی میں ویلم ویک چل رہا ہے۔ پھر اس
کی کلاسز شروع ہو جائیں گی۔ اس ایک ہفتے کے
درمیان آپ گول گول گھومیں یا زمین کھودیں آپ کی
رہائش کا بندوبست ہو جانا چاہیے۔ آپ کی جاب کا
۔۔۔ آپ کے فوڈ کا۔ اگر آپ تھوکی نہیں رہ سکتیں تو
۔۔۔ یہ سب آپ کے مسئلے ہیں اور یہ سب آپ حل
بھی کر سکتی ہیں۔ کیا نہیں کر سکتیں؟“

اس کی گردن فوراً نفی میں پھر اٹھ اٹھی۔
”آپ سب سمجھ گئیں نا؟“
”جی۔“ اس نے اوپر سے سر ہلایا۔ اندر
آنسوؤں کا ریلوایا۔
”گڈ۔ اب آپ جائیں اور زمین کھودیں۔ اورو

میرا مطلب جاب ڈھونڈیں۔ اپنی ڈگری کے دوران آپ کو ہر صورت تھری پرسنٹ واپس کرنا ہو گا۔ اپنے اخراجات کو آپ کو ایسے سنبھالنا ہو گا کہ آپ یہ تھری پرسنٹ جلد سے جلد واپس کر سکیں۔ سمجھ گئییں آپ۔

”جی۔“ اس نے سر ہلا کر بمشکل کہا۔

”نوال اور بریرہ اردو سمجھ لیتی ہیں تھوڑی بہت لیکن بول نہیں سکتیں۔ آپ کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھ میں آجائے اس لیے میں نے آپ سے خطاب کیا۔ آپ کو برا نہیں لگنا چاہیے۔“

”ویل۔“ آپ کی شکل تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔

”میری شکل ایسی ہی ہے۔“

”ایسی کیسی۔“

”جھوٹ بولنے والی۔“

”اچھا۔ اب آپ کیا کریں گی۔“

”مجھے جاب ڈھونڈنی ہے۔ جلد سے جلد۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔

”بالکل ٹھیک کہا۔ ویسے آپ کی شکل بہت تیزی سے اور بہت سخت قسم کا جھوٹ بول رہی ہے مس امرت۔ اگر آپ کو رونا آئے تو کسی ایسی جگہ چلی جائیے جہاں آپ کو کوئی دیکھے نہ۔ ٹھیک ہے۔“

”ہیلے جا کر اپنا اسٹوڈنٹ کارڈ بنوائیں۔ اپنی کلاسز کا معلوم کر لیں۔“ وہ سسم سی گئی کہ ابھی یہ سب بھی کرنا ہے۔

”کارڈ۔ یہ کہاں سے بنے گا۔“

”آپ یونیورسٹی میں کھڑی ہیں اور سب اسی یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔ یہ جو آپ اتنے سارے اسٹوڈنٹس دیکھ رہی ہیں۔ یہ سب بناؤں اپنے سب ہی کام کر رہے ہیں۔ آپ بھی یونیورسٹی میں گھومیں پھریں کہ آپ کے کام کیسے ہو سکتے ہیں۔ یا آپ کو کیسے کرتے ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پلیز دل ہی دل میں مجھے برا بھلا مت کہیے۔“ امرت کا رنگ فق ہو گیا وہ یہی کر رہی تھی۔

”اور پلیز جب آپ کی جاب کا انتظام ہو جائے تو ہانا کے نوڈلز واپس کر دیجیے گا۔“

”کر دوں گی۔“

”اوہ۔ ایک اور بات۔ دوبارہ کبھی اپنی ڈگری سے چیئر چھاڑ مت کیجئے گا۔ خاص کر پلس کو ایڈ کرنے کی غلطی۔“

یہ آخری لیکن سب سے خطرناک بم تھا جو کینٹین کے شور و غل میں بہت اہتمام سے پھٹا۔ وہ ان کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے ابھی ابھی افریقہ کے کسی قدیم قبیلے سے اسے یہی لوگ اٹھا کر لائے ہیں اور اسے بتا رہے ہیں کہ دیکھو ڈو نہیں۔ وہ کوئی جنگلی درندہ نہیں، پیٹرول سے چلنے والی بڑی سی بس ہے جس پر سفر کیا جاتا ہے اور جسے ایک ڈرائیور چلاتا ہے۔ وہ قطعاً کوئی بڑا درندہ نہیں۔

ان تینوں کی شکلیں۔ جیسے قہقروں کے دھماکوں کو وہ اندر ہی اندر دبا رہے ہوں۔ وہ اس آخری بات پر ہنسی کو دبائے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے اور وہ دھاڑیں مار کر یہ رونے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی شکل سب بتا رہی تھی۔ اسے خیال سا آیا کہ اس کی نحوست کو لے کر اس پر جو حملے کیے جاتے رہے تھے۔ وہ کتنے معمولی سے تھے ان حملوں کے مقابلے میں جو مائچسٹر میں مائچسٹر والوں نے اس پر کیے۔

وہ تو بھی سی چھوٹی سی بچی تھی۔ اسے خوش بھی نہ ہونے دیا گیا اور رلا دیا۔ رلا دیا۔

آنسوؤں کا سمندر اس کی آنکھوں میں تیرتا نظر آنے لگا۔ ان تینوں نے اس کی شکل کی طرف دیکھا اور بالکل خاموش ہو گئے پھر بائے کہ کراٹھ گئے۔ اگر وہ اس کے اولین استاد تھے تو کمال کے استاد تھے۔ انہوں نے اسے سمندر میں دھکا دے دیا تھا یا ڈوب کر مر جانا تیر کر ابھر آئے۔ مائچسٹر میں ملنے والا پہلا سبق۔ مائچسٹر

میں سنا جانے والا پہلا لیکچر اور مائچسٹر میں گرائے جانے والے اولین آنسو۔

”ویکم ٹو مائچسٹر۔“ (مائچسٹر میں خوش آمدید)

وہ کینٹین سے نکل اور ایک ایسا گوشہ ڈھونڈنے لگی جہاں کوئی نہ ہو لیکن ویکم ویک تھا۔ یونیورسٹی میں ایسا رش تھا جیسے چوہا گشت کو مال پر ہوتا ہے۔ خاص کر چین اور رنگل چوک کے پاس۔ خیر وہ سبزے پر بیٹھ گئی۔ اور منہ نیچے کر کے رونے لگی۔ آج اس کا پہلا دن تھا تو وہ بہت اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے مسکرا بھی لگایا تھا اور آئی لائنز بھی۔ میک اپ کے نام پر وہ یہ دو چیزیں زیادہ استعمال کرتی تھی۔ کائی ورتک وہ سوں سوں کرتی رہی۔ اس کا مسکارا پھیل گیا اور آنکھیں رگڑنے سے آنکھوں کے آس پاس اوپر نیچے سیاہی پھیل گئی۔ اس کے پاس ٹشو نہیں تھا۔ اپنے سفید دوپٹے سے وہ صاف کرنا نہیں چاہتی تھی۔ انگلیوں سے جتنی آنکھیں صاف کر سکتی تھی اس نے کر لیں لیکن چہرے پر کائی سیاہی پھیل چکی تھی اور وہ عجیب مضحکہ خیز سی لگ رہی تھی پر اب اسے پروا بھی نہیں تھی کہ وہ اچھی لگ بھی رہی ہے یا نہیں۔ جی بھر کر رونے کے بعد وہ اٹھی۔ ایک اسٹوڈنٹ اس کے پاس سے گزرا۔

”مجھے جاب چاہیے۔“ آنکھوں کو رگڑتے اس نے کہا۔

”جواب۔؟ میرے پاس جاب نہیں ہے۔“

”پاگل! مجھے جاب چاہیے۔ کیسے ملے گی۔؟“

اس نے اپنا غصہ اس پر اتارنا چاہا۔

”اوہ۔ مجھے تو ابھی خود ڈھونڈنی ہے۔“ وہ کہہ کر چلا گیا۔

تین چار اور ایسے ہی نمونوں سے ملتی وہ ایک جگہ جا کر کھڑی ہو گئی اور آس پاس موجود دوسرے اسٹوڈنٹس کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت تیزی سے آرہے تھے جارہے تھے۔ ہنس رہے تھے باتیں کر رہے تھے

قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ سب بہت خوش اور پر جوش تھے۔ ان سب کے چہرے دمک رہے تھے۔ وہ چالیس ہزار اسٹوڈنٹس میں بلکہ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی لڑکی ہوگی جو ایسے ایک طرف کھڑی مزید رونے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ اپنے سنہری وقت کو برباد کر رہی تھی۔ وہ چپ کھڑی سب کو دیکھتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے بھی چلنا پھرنا چاہیے۔ اور ایک دم اسے یاد آیا کہ اسے اپنا اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کارڈ صرف آج کے دن ہی بنے اور آج ہی نہ بنو اسے اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔

وہ پر جوش اسٹوڈنٹس کے ریلے میں شامل ہو گئی اور اونگوں بونگوں کی طرح منہ اٹھا کر چلتی رہی۔ گھومتی رہی۔ ایک سے دوسرے کیپس جیسے وہ کسی تاریخی عمارت کا جائزہ لینے آئی ہو پڑھنے نہیں۔

”آپ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں یقیناً۔“ گہرے جامنی یونیورسٹی ٹکڑی شرٹ پہنے اور Ask me (مجھ سے پوچھیں) کا بورڈ ہاتھ میں لیے وہ خود ہی اس کے قریب آیا تھا۔ وہ دو تین بار اس کے پاس سے گزری تھی بلکہ وہ کئی بار Ask me کے پاس سے گزری تھی۔

”مجھ سے پوچھئے میں آپ کی مدد کروں گا۔“

اوہ اچھا۔ Ask me کا بورڈ اس لیے گھوم رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی ویب سائٹ کی پروموشن کر رہا ہے۔

”مجھے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانا ہے۔“ یہ کہتے وہ اس کی بے جا لمبی ناک کو دیکھنے لگی۔

”ویل یہ تو بہت ہی آسان ہے۔ یہاں چلی جائیں۔“ اس نے اس کے ہاتھ ایک نقشہ دیا۔ اس پر ایک جگہ سرخ دائرہ لگایا۔

”آپ کا دن اچھا رہے۔“ وہ مسکرانے لگا۔ اس کی لمبی ناک پھیل سی گئی۔ وہ پھر سے اس کی ناک کو دیکھنے لگی۔

”کچھ اور پوچھنا ہے۔“ وہ جزبہ ہوا۔ یقیناً وہ جان گیا تھا کہ وہ مضحکہ خیز انداز سے اس کی ناک کو گھور رہی ہے۔

نے ایک قہقہہ لگانا ضروری سمجھا پھر وہ اکی ٹاکی ٹکڑی کر بولنے لگا۔

”جارج۔۔۔ سنو ایک ہندوستانی لڑکی۔“

”پاکستانی۔“ اس کی ہنسیوں تن گئیں۔

”جارج! ایک پاکستانی۔ بلیو اینڈ وائٹ۔“

”ڈارک بلیو شرٹ اور وائٹ وائٹ۔“

”ڈارک بلیو شرٹ اینڈ وائٹ وائٹ۔“

”ف۔۔۔ پٹاب۔“

”ڈوباٹا۔۔۔ میں آئے گی۔ اسے پلیز آگے سے آگے ریفر کرتے جانا اور اسے اسٹوڈنٹ کارڈ کاؤنٹر تک پہنچانا۔“

”ریفر کیوں کرتا ہے۔ اتنا وقت کس کے پاس ہے۔“ جارج کی آواز اس نے بھی سنی۔

”اسے ڈر لگ رہا ہے۔“ بی ٹاک والے نے سنجیدگی سے کہا۔

”ڈر۔۔۔ کیا مذاق ہے یہ۔“

”وہ سنجیدہ ہے۔ مکمل سنجیدہ۔“ بایونور شی میں اعلان کروا دو کہ سب تھوڑی دیر کے لیے بایونور شی کو خالی کر دیں تاکہ وہ اسٹوڈنٹ کارڈ بنا سکے۔ تم سن رہے ہو جارج۔“

جارج یقیناً ”سن رہا تھا۔۔۔ کیونکہ اس کا بلند بانگ قہقہہ امرجہ نے سنا تھا۔ حد ہے کوئی اسے سمجھ کیوں نہیں رہا آخر۔“

”اس طرف چلتی جائیں۔ اگلے آسک ی کو اپروچ کریں۔“

اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ وہ دائیں طرف چلی گئی اور ایک آسک ی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگا کہ جو پوچھنا ہے وہ پوچھو۔

”میں مزید آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ یعنی یہ وہ جارج نہیں تھا جسے اسے اپروچ کرنا تھا۔

”مجھے اسٹوڈنٹ کارڈ بنانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ لیں یہاں چلی جائیں۔“ اس نے بھی نقشے پر سرخ دائرہ لگا کر اسے دیا۔

اب وہ ہاتھ میں پکڑے نقشے کو دیکھنے لگی اسکول کے کورس کی کتاب کے نقشے کے علاوہ یہ اس کے ہاتھ میں آنے والا پہلا نقشہ تھا جو کسی عمارت کا تھا۔ اور وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی یہ اس نقشے کو استعمال کر کے بھٹک تو کوئی بار سکتی تھی لیکن اصل مقام پر پچاسویں کو شش پر بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مزید کسی سے کوئی پتہ نہ سننا پڑے۔ وہ آرام سے نقشہ لے کر بھٹکتی رہی۔ بھٹکتی رہی۔ اسے ایک ڈر اور بھی تھا کہ کہیں دائم نوال وغیرہ اس کے پیچھے نہ ہوں کہ دیکھیں یہ اپنے کام کر بھی پاتی ہے کہ نہیں۔

ادھر ادھر گھومتے تین چار بار آسک ی نے اسے نوٹ کیا۔

”تپ جا کیوں نہیں رہیں۔؟“ نقشہ دینے والا اس کے پاس آیا۔

”مجھے راستہ ہی نہیں مل رہا۔“

میں نے نشان لگایا تو ہے۔ بورڈ پر دھتی جائیں اور چلتی جائیں۔“

”آپ مجھے چھوڑ آئیں۔“

”ہائیں۔“ اس کی دونوں آنکھیں کچھ زیادہ ہی پھیل گئیں۔ امرجہ کا انداز ہی ایسا تھا کہ بھائی ڈر مجھے میری دوست کے گھر تک تو چھوڑ آؤ۔

اس بار اس نے باقاعدہ ہاتھ سے اشارے کر کے اسے سمجھایا۔ یہاں سے دائیں پھر سیدھا۔ پھر تھوڑا سا بائیں طرف۔

”میری نہیں سمجھ میں آ رہا۔ آپ مجھے چھوڑ آئیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ڈر۔!“ اس بار وہ بے چارہ ایسے حیران ہوا جیسے اس کا کوئی مرہ رشتے دار اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔

”کیسا ڈر۔؟ آج ہالوین نہیں ہے۔“

”مجھے ان سب سے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے آس پاس چلتے پھرتے ہر قوم و نسل کے لڑکا لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

امرجہ کی طرف اچھٹے سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بھی نقشے پر سرخ دائرہ لگا کر اسے دیا۔

”مجھے میپ نہیں چاہیے۔“

”تو۔۔۔ انتظامیہ نے ابھی تک ایریس کا انتظام نہیں کیا یہاں۔“

”اف کتنی تیز زبانیں تھیں ان سب کی۔“

”مجھے وہاں تک چھوڑ آئیں۔“

”میں کیوں۔؟ آپ کو آسانی سے راستہ مل جائے گا۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں۔ میں آسک ی ہوں۔“ ڈر اب یو نہیں۔

”نہیں مل رہا ناراستہ۔“

”سب اپنے اپنے راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آپ کو بھی مل جائے گا۔“

”سب تیز ہیں۔ چالاک ہیں۔ مکار ہیں۔ میں نہیں ہوں۔ میں ڈر پوک ہوں۔“ اس نے ردائی سے اردو میں کہا اور خاموش ہو گئی اور صرف کندھے اچکائے کہ بس نہیں مل رہا۔

”سب ذہین ہیں۔ ذمہ دار ہیں۔ بڑھے لکھے ہیں اور خاص طور پر اپنی مدد آپ کے قائل ہیں۔“

جواب اردو میں آیا۔ اس نے جھٹکے سے سر کو اٹھا کر اس انگریز کو دیکھا جس کی گہری بھوری آنکھیں تھیں اور سفید سرخی مائل رنگت تھی۔ اور بڑے بڑے کان تھے۔ کچھ زیادہ ہی بڑے کان تھے۔

اس کاواکی ٹاکی بولا۔

”بلیو شرٹ وائٹ ڈوباٹا۔ پاکستانی۔ نظر آئے تو پلیز آگے ریفر کریں۔“

”میں تھک گئی ہوں چلتے چلتے۔ مجھے بھوک بھی لگی ہے۔ مجھے کتنا اور آگے ریفر کریں گے۔“

”یہ آپ کا پہلا دن ہے؟“

”جی۔“

”آپ پہلے ہی دن تھک چکی ہیں۔ آسک ی کا بورڈ پکڑے یہاں کھڑے یہ میرا میسران ہے۔ میں ابھی تک نہیں تھکا۔“

”آپ لڑکے ہیں۔“

”آپ جیسی لڑکیاں بھی نہیں تھکیں۔“ اس نے در کھڑی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو بورڈ لیے کھڑی

تھی اور تیزی سے اسٹوڈنٹس کی رہنمائی کر رہی تھی۔

”آپ ہم سے کچھ بھی پوچھ کر ہم پر احسان نہیں کر رہیں بلکہ ہم کر رہے ہیں۔ آپ نہیں ہم تھکے ہیں۔ ہمیں اس کام کے پیسے نہیں مل رہے۔ ہم یہ بورڈ لے کر رضا کارانہ خدمات پیش کر رہے ہیں۔ آپ

ایک پاس کی طرح ہم پر حکم نہیں چلا سکتیں۔ تھک گئی ہیں تو سینما جا کر بیٹھ کر ٹام اینڈ جیری دیکھیں۔ آپ کی ٹھکن اتر جائے گی۔“

”آپ کو بات کرنے کی تیز سیکھنی چاہیے۔“

”آپ کو ٹھکن اتارنے کی مشق کر لی چاہیے۔“

”میں بہت باہمت ہوں۔“ اس نے حاکر کہا۔

”ہسٹ آف لگ۔“ اس نے کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا کہ اب جاؤ۔

وہ دوسری طرف جا کر ایک لڑکی سے پوچھنے لگی اور آخر کار پوچھتے پوچھتے اسٹوڈنٹ کاؤنٹر تک آ گئی۔ اور اپنے کاغذات دینے کے بعد تصویر کے لیے ڈیجیٹل کیمرے کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

”تمہارا کچھ کم ہو گیا ہے؟“ کاؤنٹر سرنے کاؤنٹر سے اپنا آدھا انجیا سر آگے کر کے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو مسکراؤ بھئی۔ تمہا چمپسٹریں ہو۔“

”ماچمپسٹریں مسکراتا رہتا ہے۔؟“

”بالکل۔ کیونکہ ماچمپسٹر مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہاں اداسی کا کیا کام۔ یہ تو دنیا بھر کے

Swans (راج ہنس) کی جگہ ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

”بلیک سوان۔“ اسے بڑبڑاہٹ سنائی دی اور اس کی تصویر کھینچ دی گئی۔

”یہ نہیں۔ ایک اور پلیز۔“ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھنے سے ہٹ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“

اس بار وہ مسکرائی اور وائٹ سوان بن گئی۔ کیونکہ وہ دل سے مسکرائی وہ مسکراہٹ جو اس نے یہاں آکر سیکھی تھی۔

کیونکہ اسے رونے کی عادت تھی۔ اسے یہی

عادت ڈال گئی تھی۔ بات بات پر رونے کی۔ اسے بات بات پر رونا سب کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اور وہ دل چھوٹا کر بیٹھتی تھی کیونکہ اسے دل بڑا کرنا سکھایا ہی نہیں گیا تھا یہی اس کا ماحول تھا جو اسے ملا تھا۔ اسی ماحول کی وہ عادی تھی اسے نہیں بتایا گیا تھا کہ جس زمین پر رنگا جاتا ہے اس پر شان سے چلا بھی جاسکتا ہے اور دوڑا بھی۔ وہ ایسی ہی رہتی تھی، روٹی دھوئی زندگی گزارتی رہتی اگر وہ یہاں نہ آتی۔ کیونکہ اسے کبھی نہیں کہا گیا تھا ”یو آر اے بڑی مائی ڈیر۔ فلائی جسٹ فلائی۔“ (میری پیاری تم ایک پرندہ ہو۔ تو تم اڑو۔ بس اڑو)

اسے تو کہا گیا تھا کہ تو منحوس ہے۔ بد بخت ہے۔ کالی نظر اور کالی زبان والی ہے۔ ماچسٹریونیورسٹی کے بھانگ سے اندر آتے ہی کچھ اور سکھایا جا رہا تھا۔ ”مسکراؤ کہ رونے کے لیے زندگی میں کوئی دن نہیں بتا۔“

”اڑو کہ اڑنے کا حق صرف پروالوں کے پاس ہی نہیں۔“
”اور ایسے کھل کر مہکو تم سے بہتر گلستان میں کوئی گل نہیں۔“

”تم سب کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس سب ہے۔ تمہارے ہاتھ میں سب ہے۔ ناکامی اور مایوسی کی فضا میں ہمیشہ سانس بھرنا تم پر فرض نہیں۔“
کارڈ لے کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے کاؤنٹر سر کا شکریہ ادا کیا بس اتنی ہی سی تو بات تھی۔

اس کی سمجھ میں آگیا کہ اس درس گاہ کو دنیا کی بڑی درس گاہوں میں کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ اس درس گاہ نے اسے پہلے دن ہی ریگن سے چلنا سکھادیا تھا۔ ذمہ داری۔ خود اعتمادی۔ آگے بڑھ کر کر لینے کی صلاحیت عطا کر دی تھی۔

ہاتھ میں کارڈ لے کر وہ اپنی مسکراہٹ پھیلی سیاہی سے اپنی آنکھوں کو دیکھنے لگی اور ہنس پڑی۔ وہ برجوش تھی۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا اگر وہ بد صورت بھی لگ رہی تھی تو۔ یہاں دل والوں کو سیوٹ کیا جاتا تھا۔

خوب صورت چہروں کو نہیں۔ اور دل کو کبھی۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ سب آسان تھا۔ سب۔ کچھ بھی دور نہیں تھا۔ سب پاس تھا۔ دل ہاتھوں کی دونوں ٹھپوں میں تھا۔ ڈیبا ر ٹمنٹ سے نکل کر وہ باہر آگئی۔ دن روشن تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس کے بال نرمی سے لہرائے گئے۔ اس نے اپنے بیک کا مشرپ لمبا کیا اور اسے دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح کراس کر کے پہن لیا (دائیں سے بائیں طرف) اور اعتماد کے ساتھ چلنے لگی۔

”امرحہ واجد“ گولڈ میڈل لینے کے لیے دوڑ میں پوری جان سے شامل ہو چکی تھی۔ تماشائیوں کی خالی نشستوں پر اسے کسی صورت نہیں بیٹھنا تھا۔ اس کے نام کی نشست اب وہاں کبھی نہیں ہوگی۔

آکسفورڈ روڈ پر وہ سیدھی چلتی جا رہی تھی۔ صبح اس نے وہ مناسبانشتا کیا تھا اور اب اسے بھوک لگی تھی لیکن وہ کھانا کھانے نہیں جا رہی تھی نوکری کی تلاش کے لیے جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے اندر کی طرح باہر بھی اسٹوڈنٹس کی بہت رونق تھی۔ کچھ دور ذرا آگے سڑک کے اس پار اسے چرچ نظر آیا۔ اس کا دل چاہا کہ اندر جا کر دیکھے چرچ کو پھر وہ اپنی ہی سائیڈ پر چلتی رہی اب دو سال پہلے رہتا تھا تو وہ سب دیکھ لے گی۔ اگر نوکری کا انتظام نہ ہوا تو ایک ماہ بعد ہی واپس جانا پڑے گا۔ سڑک ختم ہو گئی لیکن اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں وہ نوکری کی بات کر سکتی۔ سڑک کے سامنے دوسری طرف اسے عبداللہادی حلال فوڈ کی دوکان نظر آئی۔ سڑک پار کر کے وہ اس دوکان میں آئی۔ بلاشبہ اس کی ٹانگیں کنب رہی تھیں۔ بھلے سے کانپتی رہتیں اس نے اندر جا کر کاؤنٹر پر اسے بات کی۔ اس نے سلیقے سے اسے بتایا کہ فی الحال وہاں اسے نوکری نہیں دی جاسکتی۔

”کیا کچھ دن بعد دی جاسکتی ہے۔ دو ہفتوں بعد۔“

”نہیں۔ شاید ایک سال بعد جب میں یہاں سے چھوڑ دوں گا۔“
وہ اگلے اسٹور ”یک اینڈ کلک“ میں گئی۔ وہ کمپیوٹر اسٹور تھا اور وہ کمپیوٹر مینٹننگ کے بارے میں یقیناً نہیں جانتی تھی اور ظاہر ہے اسے نوکری نہیں دی گئی، جبکہ اسی اسٹور پر دوسری لڑکیاں کمپیوٹر پرپرنگ کا کام کر رہی تھیں۔

ان ہی اسٹورز اور دوکانوں کے عین سامنے سڑک پار کر کے مشہور برگر اور۔۔۔ بڑا کچھوٹے چھوٹے ریستورنٹ کھلے تھے وہ وہاں بھی گئی اور زیادہ خود اعتمادی سے گئی۔ اب اس کے صرف دل کی دھڑکن تیز تھی لیکن شام تک نہ اس کے دل کی دھڑکن تیز رہی تا ناگوں میں کیک پائٹ، صرف زبان میں تیزی رہی جو ہر ریستورنٹ، دوکان، اسٹور میں جاتے ہی تیزی سے چلنے لگتی۔ وہ تھک گئی تھی لیکن رکی نہیں۔ اسے بھوک لگی تھی لیکن میسے بچانے کے لیے اس نے باہر سے کچھ بھی لے کر نہیں گھایا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اس نے یہ کام کیا کہ اس نے سائیکل چلانے والی ایک لڑکی سے لفٹ مانگی اس نے کانڈر پر لکھے ہوئے پتے کو لڑکی کے آگے کیا۔

”میں تمہیں مین روڈ تک لے جاسکتی ہوں۔ آگے تم پیدل چلی جانا۔“ اس نے کہا۔
اب سائیکل پر بیٹھتے اسے قطعاً ”نہی نہیں آرہی تھی۔ اس کے پیٹ میں بھوک کی وجہ سے بل پڑ رہے تھے لیکن اسے رونا نہیں آ رہا تھا وہ اس پانچم زدہ بھی نہیں تھی۔ وہ خود کو بے چاری بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔

صبح ان ہی کھلی روشن، قدیم عمارات سے گھری سڑکوں سے آتے ہوئے بھی وہ امرحہ واجد ہی تھی اور ان ہی سڑکوں سے پھر سے گزرتے ہوئے بھی وہ امرحہ واجد ہی رہی۔

تبدیلی ظاہر میں نہیں باطن میں آئی تھی۔ اور کافی سے زیادہ آچکی تھی۔ کافی سے زیادہ آنے والی تھی۔

گھر آئی تو اس کا لچ کاؤنٹر پر رکھا تھا اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سب اپنے اپنے کام پر جا چکی تھیں۔ اس نے کچ کورات کے کھانے کے طور پر کھالیا اور منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو کر سو گئی۔ دو گھنٹے بعد وہ اٹھی تو کتابیں پڑھنے لگی۔ رات کو وہ ایک ایک کر کے آئی گئیں اور سو گئیں لیکن وہ جاگ کر پڑھتی رہی۔

گلے دن صبح شری کے ساتھ اس نے جاب کی بات کی کہ اسے کہاں جانا چاہیے اور کہاں نہیں۔ شری نے اسے دو تین جگہوں کے نام بتائے اور پتے بھی سمجھا دیے۔

پہلے وہ یونیورسٹی آئی تاکہ اپنی کلاسز کا معلوم کر سکے۔ اس کے لیے یونیورسٹی ایریا میں الگ سے بہت وسیع کیمپ لگایا گیا تھا جہاں ہر ڈیپارٹمنٹ کا کاؤنٹر لگا تھا اور سینٹر اسٹوڈنٹس ان کاؤنٹرز پر اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر انجام دے رہے تھے سب گھر پر پل یونیفارم میں ملبوس تھے تاکہ انہیں دور سے ہی پہچان لیا جائے۔ اس ایریا میں بھی ایسے ہی رش تھا جیسے وہاں ایک مہذب انوار بازار سجا ہوا۔ آہستگی سے لیکن جلدی جلدی بولنے کی آوازیں تھیں اور ایک ساتھ ایک جگہ جمع ہو کر شور مچا رہی تھیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مطلوبہ کاؤنٹر تک آئی اور بنیادی معلومات لینے لگی۔ لیکن ایک مسئلہ تھا جو لڑکی اسے سب سمجھا رہی تھی وہ فریج تھی اور اس کی انگلیں اچھی ہو کر بھی امرحہ کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اس نے لڑکی سے ایک دوبار کہا کہ۔

”برائے مہربانی پھر سے بتائیں اور آہستہ بتائیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی۔“ اور لڑکی نے ایسا کیا بھی لیکن امرحہ پھر بھی کچھ خاص سمجھ نہ سکی۔
”ڈیرک! سنو تم ان کی مدد کرو۔“ لڑکی نے خوش اخلاقی سے اپنے ساتھی سے کہا جو ان دونوں کی طرف سے رخ موڑے کسی دوسرے کا مسئلہ حل کر رہا تھا۔
”جی۔“ ڈیرک نے اس کی طرف دیکھا اور اس

کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

یہ وہی Ask me کا بورڈ پکڑے لمبی ناک والا تھا۔ اس سے پہلے کہ امرجہ کچھ بولتی۔ اس نے اپنی ناک کو ایک ہاتھ سے چھپا لیا۔

امرجہ کا دل چاہا واقعی اس کی ناک پر اپنے ہاتھ میں پکڑی موٹی فائل دے مارے۔ یہ انسان یقیناً اس کا کوئی مشہور زمانہ مذاق بنادے گا جو ساری یونیورسٹی میں مشہور ہو جائے گا۔

”فرمائیے۔ میں آپ کو کیسے ڈرا سکتا۔ آئی ایم سوری آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

ناک بدستور اس نے بائیں ہاتھ سے چھپا رکھی تھی۔ امرجہ نے کانڈ اس کی طرف بڑھایا جس پر اس کے مضمون لکھے تھے اور اس نے بڑھ کر دوسرے کانڈ پر کم سے کم پندرہ منٹ لگا کر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ سب کچھ لکھ دیا۔ کلاس کے اوقات کار۔ پیچرز کے نام۔ مزید مدد کے لیے اسی کی جماعت کے دو تین ہم جماعتوں کے نام۔ ان کی رہائش کے پتے۔ پھر اس نے نقشہ نکالا اور اس پر سرخ دائرہ لگایا۔ ”یہ آپ کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔“

”اسے اس کا ڈیپارٹمنٹ دکھا لاؤ۔ اس نے فریج لڑکی سے کہا۔

لڑکی نے اچھٹے سے اسے پھر ڈیرک کو دکھا اور امرجہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

”کیوں۔ یہ خوب چلی جائے گی نا۔“

”نہیں۔ یہ خود نہیں جاتی۔ اسے ڈر لگتا ہے۔“

امرجہ نے ڈیرک کے ہاتھ سے کانڈ جھپٹ لیا۔ ڈیرک کے قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ پہلے دن جو جو لوگ اسے ملے ہیں ان سے دوبارہ اس کی ملاقات نہ ہو۔ ایک لڑکی اس کے پاس سے گزری اور ایک دم سے رک گئی۔

”کوئی مدد چاہیے؟“ ساتھ ہی اس نے امرجہ کے ہاتھ میں پکڑا کانڈ لے لیا۔

”یہاں جانا ہے نا۔ میں ابھی بیس سے آرہی ہوں۔ بلکہ پھر سے وہیں جاری ہوں۔ آجاؤ۔“

میرے ساتھ۔“ وہ خواری سے بیچ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ اسے ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ گئی۔ اس نے اپنی کلاسز دیکھ لیں اور اوقات کار بھی اپنی کلاسز دیکھ کر اسے خاص خوشی ہوئی۔ اس کی سوچ سے زیادہ خوب صورت تھیں۔

یونیورسٹی سے نکل کر وہ پیدل ہی پھر سے نوکری کی تلاش میں لگ گئی۔ لیکن یہ کام تو مشکل ہی بنتا جا رہا تھا۔ یونیورسٹی سے بہت زیادہ دور وہ نوکری کر نہیں سکتی تھی۔ اس طرح اس کا پس کا کرایہ لگتا اور اس کی بچت مشکل سے ہی ہوا پاتی۔

اس کی کلاسز شروع ہو گئیں۔ لیکن کام نہیں ملا۔ اسے پریشانی یہ تھی کہ اگر وہ کام نہ ڈھونڈ سکی تو پھر سے دائم کا لیکچر سننا پڑے گا گو کہ وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا لیکن اپنی جگہ غلط وہ بھی نہیں تھی۔ وہ انتھک کوشش کر رہی تھی۔

ایک دن یونیورسٹی سے پندرہ منٹ کی واک پر واقع کینے کے سامنے سے اس کا گزر ہوا۔ وہ یہاں پہلے بھی آچکی تھی لیکن اسے جواب دیا گیا تھا کہ انہیں ضرورت نہیں ہے۔ اب ضرورت ہے کا بورڈ کینے کے سامنے رکھا تھا۔ اس نے پہلے کینے میں بیٹھ کر کافی پی پھر کاؤنٹر تک آئی۔ اسے یہاں کام تو فوراً ہی مل سکتا تھا لیکن صرف ایک مسئلہ تھا اور کافی بڑا مسئلہ تھا جو ویٹریس اسے نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے گھنٹوں تک اسکرٹ پہن رکھا تھا جو ایک مشہور کافی کے لیبل جیسا تھا، یعنی کمپنی کا چلنا پھرنا اشتہار تھیں۔ اسے اشتہار سے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ یہ اسکرٹ تو نہیں پہن سکتی تھی اور جو حالات جارہے تھے ان کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اس واحد نظر میں آنے والے ”ضرورت ہے“ کے موقع کو۔ ہاتھ سے جلنے بھی نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے دراز قد فریبی مائل گورے چنے انگریز سے بات کی۔ اس نے امرجہ

سے چند سوالات پوچھے اور اسے ہاں کہہ دیا۔ وہ خوش ہونے کے بجائے اسے دکھ سے دیکھنے لگی یعنی نوکری ملی بھی تو کون سی جس پر شاید ابھی انکار ہو جائے جب وہ اس کی انگلی بات سنے گا۔

”مجھے اس کام کی بہت شدید ضرورت ہے۔ اگر مجھے یہ نوکری نہ ملی تو میرا مستقبل بہت بری طرح سے تاریک ہو جائے گا۔“ اس نے اپنی طرف انگریز کو جذباتی کرنے کی کوشش کی تھی۔

”میں نے تمہیں کام پر رکھ لیا ہے۔“

”میں یہ ڈریس نہیں پہن سکتی۔ میں جینز پر یہ شرٹ پہن لوں گی بس۔“ اس نے ویٹریس کی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں اتنا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جاسکتی ہو۔“

”اس دنیا کے روشن مستقبل کے لیے کیا آپ صرف اس نامکمل ڈریس کو نظر انداز کر کے تعلیم حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتی اس لڑکی پر ایک احسان نہیں کر سکتے۔ دنیا کا ہر انسان علم حاصل کرنے والے کی عزت کرتا ہے۔“

”مجھے صرف اپنے روشن مستقبل کی فکر ہے۔“

”آپ کس مذہب کے ماننے والے ہیں؟“

اس نے اسے گھورا۔ یورپ میں بھی کسی سے بھی اتنی جلدی اس کے مذہب کے بارے میں نہیں پوچھ سکتے۔ وہ برلمان جاتے ہیں۔

”میں یہودی ہوں۔“ امرجہ کی سخی کم ہو گئی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

”مجھے گھورنا بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔“

”دیکھیے جناب اگر آپ مجھے کام دیں گے تو سب آپ کی تعریف کریں گے ایک یہودی نے ایک مسلم کا احترام کیا۔ اس کی اخلاقیات کا خیال رکھا۔ یونو وغیرہ وغیرہ۔“

”یہ وغیرہ وغیرہ کیا ہے؟“

”مزید تعریف۔ اور تعریف۔ سب آپ کو اپنے سر آنکھوں پر ٹھامیں گے۔“

”لیکن مجھے اپنی کرسی پر بیٹھنا ہی اچھا لگتا ہے۔“

”پھر بھی ذرا سوچئے۔ یہ یونیورسٹی ایریا ہے۔ اسٹوڈنٹس آپ کی کس قدر عزت کریں گے۔ ہو سکتا ہے بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ سالانہ کانوکیشن ڈے پر آپ کو خاص طور سے مدعو کیا جائے گا اور آپ تقریر بھی کریں گے۔ ایسا دن آپ کی زندگی میں دوبارہ نہیں آسکتا۔“

”مجھے کانوکیشن میں جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”جب آپ جائیں گے تب آپ کو یہ بہت دلچسپ لگے گا۔“

وہ کاؤنٹر پر بائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں بجانے لگا اور اسے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس کی نیلی آنکھیں مزید نیلی ہو گئیں۔

”میں نے سنا تھا انگریز بہت رحم دل ہوتے ہیں۔“

”میں پولش ہوں۔“

”مجھے اندازہ تھا لیکن پولش تو دنیا بھر میں انسان دوست مشہور ہیں۔ اخلاقیات کی پاس داری کرنے والے۔ انسانی خدمت میں سب سے پہلے آنے والے۔ اور مدد کے لیے کبھی نہ پیچھے ہٹنے والے۔“

”تمہاری زبان ہمیشہ ایسے ہی چلتی ہے۔“

”نہیں۔ لیکن جو کافی میں نے ابھی آپ کے یہاں سے لی ہے اس کے بعد سے کافی زیادہ۔ آپ مجھے ایک ہفتے کے ٹرائل پر رکھ سکتے ہیں۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”میں شرط لگا سکتی ہوں جب لوگ مجھے ایک مسلم لڑکی کو فل ڈریس میں دیکھیں گے تو وہ اس طرف گھنچے چلے آئیں گے کہ یہ ایک انسان دوست کا کینے ہے۔ یہاں کے مالک نے انسانیت کے لیے نام نہاد اصول کو توڑ دیا۔“

کیا واقعی؟“ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کاؤنٹر بجانے لگا۔

”بالکل۔ آنا کر دیکھ لیں۔“ یہ کہتے امرجہ کی نظر اتاری جالی چاہیے تھی۔

”ٹھیک ہے کل سے آجانا۔ تمہیں اصل کا فلفلی پرسنٹ ملے گا۔“

”مجھے منظور ہے۔ ویسے آپ کو یہ اندازہ ہو گا ہی کہ روزانہ اس کیفے میں کتنے لوگ آتے ہیں۔“

امرحہ کی ذہانت بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں دس سال سے یہ کیفے چلا رہا ہوں سال میں صرف ایک بار آنے والوں کو بھی پہچان لیتا ہوں۔“

”میرا مطلب تھا کہ اگر کل زیادہ لوگ آئے تو۔“

”تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔“ وہ آنکھوں کو اندر کی طرف لے جا کر مسکرایا۔ اور یہ مسکراہٹ اس پر جم کر رہ گئی۔

وہ گھر گئی تو اس نے شرلی عذرا وغیرہ سب سے کہہ دیا کہ کل ہر صورت وہ خود اور اپنے دوستوں کو لے کر اس کے کیفے آجائیں۔ ان چاروں نے آنے کا وعدہ کر لیا سوائے ہانا کے۔ اور انہوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ کوشش کر کے اپنے ایک یا دو دوستوں کو بھی ساتھ لے کر آئیں گی۔ صبح وہ دایم اور نوال کے پاس بھی گئی۔ انہیں سب سچ سچ بتا دیا۔ دایم کتنی ہی دیر بے یقینی سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

”تم نے کس چالاک سے یہ سب کیا ہے۔“

”کرنا ہوا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”میں اپنے ہم جماعتوں اور دوستوں کو بھی کہہ دیتا ہوں۔ کتنے دن کا ٹرائل ہے۔“

”ایک ہفتے کا۔ اگر روز آٹھ دس لوگ آئیں تو۔“

”آٹھ دس تو کم ہیں۔ آخری دن تک میں تمہیں چالیں کروں گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

اور پھر یوں پہلے دن دس۔ دوسرے دن پندرہ پھر اٹھارہ۔ تیس۔ پچیس اور آخری دن پورے تین کم پچاس اسٹوڈنٹس وہاں کافی پینے گئے اور مزے کی بات

یہ کہ انہوں نے اپنی ہر فارمنس کی حد ہی کر دی۔ وہ کافی پینے جاتے گاؤنٹرنگ آتے جاتے۔

”کتنے نوبل انسان ہیں آپ۔“ مسکرا کر کہا جاتا۔

”آپ نے ایک مستلم خاتون کو بغیر کسی امتیاز کے نوکری دی۔“

”آپ جیسے انسان دوست لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔“

”ہم سب ضرور اپنے پروفیسرز سے آپ کی تعریف کریں گے۔ آپ کو ہمارے کانوکیشن ڈسے میں ضرور آنا چاہیے۔“

”بہت فرشتہ صفت ہیں آپ۔ ایسی صفت آج کل ناپید ہیں۔“

”آپ ہم ہر روز صرف یہاں ہی آیا کریں گے کافی پینے۔“

”جھ دن ہر ہر فارمنس کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتا رہا۔“

”میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ڈرامے دیکھے لیکن ان چھ دنوں میں جو یونیورسٹی والوں نے میرے کیفے میں ڈرامہ سیشن کیا وہ سب سے شاندار رہا۔“

وہ دنگ کھڑی گاؤنٹرنگ ہاتھ رکھے اسے ہنستے ہوئے دیکھتی رہی اس کا تو خیال تھا اس کا پلان کامیاب رہا لیکن یہ کیا۔

”تم ایک کاروباری انسان کو الو نہیں بنا سکتیں۔“ رائٹ۔

”رائٹ۔“ اس نے کمزور سارائٹ کہا۔

”پر۔۔۔ تم ایک کاروباری انسان کو متاثر ضرور کر سکتی ہو۔“ رائٹ۔

”رائٹ۔“ وہ مسکراتے لگی۔

”دیکھو مس اخروٹ۔! میں تمہیں یہاں ایسے نہیں رکھ سکتا۔“

وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا اور امرحہ بھی اس کی خوشی اڑن پھو ہو گئی۔

”کافی کمپنی اس ڈریس کے لیے مجھے بے کرنی ہے۔ اور اس کیفے کے پچاس فیصد مالکانہ حقوق کمپنی کے

پاس ہی ہیں۔ لیکن کیونکہ میری دلچسپی بڑھ گئی ہے کہ میں یونیورسٹی کے کانوکیشن میں بلایا جاؤں تو میں تمہیں عارضی طور پر یہاں رکھ سکتا ہوں۔ جب تک تمہیں کہیں اور نوکری نہیں مل جاتی تم یہاں کام کر سکتی ہو لیکن اگر کمپنی نے اعتراض کیا تو مجھے تمہیں نورا نکالنا ہو گا۔“

”کمپنی اعتراض نہیں کرے گی۔“ وہ خوشی سے نہال ہو کر بولی۔

”کیوں؟ تمہیں کیسے پتا۔؟“

”میں دعا کروں گی، کمپنی اعتراض نہ کرے۔“

”تم یہ دعا کیوں نہیں کرتیں کہ تمہیں کہیں اچھا سا کام مل جائے۔“

”وہ بھی کر رہی ہوں ساتھ ساتھ۔ لیکن فی الحال مجھ پر یہی دعا واجب ہے۔ کہ کمپنی اعتراض نہ کرے۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے مسکراتا تھا۔

”اور مجھے اخروٹ مت کہئے۔ آپ مجھے چلغوزہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ چلغوزہ مجھے بہت پسند ہے۔“

وہ خوشی سے بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔ کیفے سے باہر ہانچسٹری سڑکوں پر اڑنے والی رات اس رات بہت روشن تھی۔ جب سیاہی سفید ہو جائے۔ راتیں روشن ہو جائیں تو زندگی کی شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ خوشبو دیتی ہوئی۔ پھولوں، پھلوں سے لدی ہوئی۔

وہ کام سے بھی لگ گئی اور کلاسز میں بھی مصروف ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے بھی نوڈلز کھانے شروع کر دیے۔ اپنی پہلی تنخواہ سے اس نے سب سے پہلے ہانا کی پسند کے نوڈلز کا برڈ پیکٹ لیا جو وہ دو ہفتے تک کھا سکتی تھی۔ ساتھ ہی انڈے، دودھ کے ڈبے، جام، ڈبل روٹی لے کر اس نے فریج کو بھرا تاکہ وہ سب بھی استعمال کریں۔ اب اسے رہائش کی تلاش تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا رہائش کا مسئلہ بھی حل کر رہی تھی۔ گو شرلی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اتنی پریشان نہ ہو

رہائش کے لیے لیکن وہ پریشان تھی اگر اسے انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ڈھیٹ بن کر مستقل ہی وہاں جم جاتی اور برائے بناتی کہ اسے رہائش نہیں مل رہی۔ چونکہ اسے شروع سے ہی بہت زیادہ کھانے کی عادت تھی تو ابھی وہ مکمل طور پر اپنی بھوک پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔ چنے مٹے سے ناشتے سے تو اس کا کچھ بننا ہی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ تو وہ شام کی چائے میں اڑا جایا کرتی تھی۔

دوسرے کے کھانے کے وقت یونیورسٹی میں اسے کسی نہ کسی کی ٹویٹ مل جاتی۔ ٹویٹ۔؟ (Twit)

تو ٹویٹ کا قصہ کچھ یوں تھا کہ کسی بھی فریڈیا ہائے ہیلو فریڈیا کلاس فیلو کے پاس جایا جانا اور اس سے کہا جاتا۔

”ٹویٹ می پلیز۔“ (مجھے ٹویٹ کرو) اگر وہ چاہتا یا انورڈ کر سکتا تو اسے ٹویٹ کر دیتا یعنی ایک کپ چائے، کافی یا کوئی بھی کولڈ ڈرنک پلا دی جاتی۔ دایم گروپ نے اسے اپنی ساری ٹویٹس دے دی تھیں۔ ٹویٹ مانگنے والے کو وہ ٹویٹ واپس بھی کرنا ہوتی تھیں۔ اب منظر کچھ یوں ہوتا کہ دایم یا نوال اس سے کہتے کہ جو سامنے حوا ہینا ہے۔ اس کے پاس میری چھ ٹویٹس ہیں۔ اس کے پاس جاؤ اور کہو۔

”ٹویٹ می بیک پلیز۔“

وہ جاتی اور کہہ دیتی۔ اسی طرح اسے شرلی عذرا اور ایسے ہی دوسرے ہائے ہیلو دوست اپنی ٹویٹس دے دیتے۔ اکثر جن کی تین یا چار ٹویٹس آٹھویں ہو چکی ہوتیں ان کا وہ برگر کھا لیتی، لیکن برگر یا سینڈویچ یا پڑا کھائے جانے پر ایک ایکسٹرا ٹویٹ منفی ہو جاتی یعنی اگر چار ٹویٹس ہیں تو تین کا برگر اور ایک منفی یعنی بانی زرو۔ اور اگر تین ہی تھیں تو ایک جمع ہو جاتی یعنی برگر کھانے والے کے کھاتے میں ایک ٹویٹ آجاتی۔ پہلی بار تو امرحہ کو کافی سے زیادہ شرم آئی پھر اس نے محسوس کیا کہ امیر کبیر اسٹوڈنٹس بھی ایسا کر لیتے ہیں تو وہ بھی کرنے لگی۔ وہ دایم نوال، شرلی کے پاس

جاتی "ریفری آئیٹیٹ پلیز" کہتی وہ سوچتے۔ ادھر ادھر دیکھتے۔

"وہ سامنے۔۔۔ ہاں وہاں گراؤنڈ میں۔۔۔ وہ جس نے سفید شرٹ پہنی ہے۔ ہاں وہی اس کے پاس جاؤ۔"

کانڈ پر لکھ دیا جاتا "ٹوئیٹ ہریک" (اسے ٹوئیٹ واپس کر دو) اسی کانڈ پر ٹوئیٹ دینے والا لکھ دیتا "بقایا دو وہ باقی کی دو بھی ہرپ کر جاتی۔ اسے بڑا مزا آرہا تھا۔ اسے ٹوئیٹ پر ٹوئیٹ مل رہی تھیں۔ اس نے دادا کو سب بتایا۔

"مانگنے کے نت نئے انداز۔" وہ ہنسنے لگے۔
"دینے کے نت نئے انداز دادا۔"

"کیا کمال کا جواب دیا ہے تم نے۔" وہ بہت خوش ہوئے اس دن وہ دائم گروپ کی ایک لڑکی اقصیٰ کے پاس گئی اور ٹوئیٹ ریفر کر کے لے کر آئے۔

"یہ تمہیں لائبریری میں ملے گا ورنہ کہیں نہیں ملے گا اس وقت۔ بڑے بڑے کان ہیں۔ لائبریری میں کسی سے بھی پوچھ لیتا۔ تمہیں اس کا پتا دیا جائے گا۔ پوری بیس ٹوئیس ہیں میری اس کیاس۔"

"نہیں۔۔۔!" امرجہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آرام سے چار پانچ برگر کھائے جاسکتے ہیں کافی بھی۔ دو ہفتے آرام سے نکل جائیں گے۔

یعنی اگلے دو ہفتوں کے لیے بالکل خوار نہیں ہونا پڑے گا۔ وہ لائبریری میں آگئی اور سرگوشی کے انداز سے اس کا پوچھا۔

"میں سمجھ نہیں پاتی۔ کون سی کتاب چاہیے۔"

"اف۔ کتاب نہیں چاہیے۔ عالیان کا پوچھ رہی ہوں۔ جس کے بڑے بڑے کان ہیں۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ لائبریرین کے چہرے پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی اور اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ وہ اس کے پاس آئی اور کانڈ جس پر اقصیٰ کی لکھائی میں ٹوئیٹ کا لکھا تھا اس کے آگے کیا۔

اس نے اپنی موٹی سی کتاب سے نظر اٹھا کر اس

چٹ کو بڑھا پھر جس ہاتھ نے اس چٹ کو تھام رکھا تھا اسے خفگی سے گھورا۔ اس کی پیشانی پر ایک پتلی سی لکیریں کر غائب ہو گئی۔

"سوری۔ اس وقت نہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"پھر کس وقت؟"

"بس آج نہیں۔ ان فیکٹ اگلے ہفتے تک نہیں۔ برائے مہربانی اس سے پہلے مجھے تنگ نہ کیا جائے۔"

"پر مجھے تو ابھی اسی وقت بھوک لگی ہے۔" اس کی تیز آواز پر وہ بھوری آنکھوں والا حیران رہ گیا۔ پیشانی پر خفگی سے اس بار وہ لکیریں بن کر ابھریں اور وہیں براجمان رہیں۔

"ٹوئیٹ می بیک۔" امرجہ نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر تھوڑی اور تیز آواز میں کہا۔ یہ وہی تھا جو اس دن وہ لکھ دیک کے دوران اس پر چلا رہا تھا۔ اب وہ اس پر چلا سکتی تھی۔

"میں نہیں کر رہا۔" اس نے ذرا سختی سے کہا۔
"میں کیا کروں۔ مجھے تو بھوک لگی ہے۔" اس نے اس طرف آتے ہوئے ایک اور کام کیا تھا۔ اس نے کانڈ پر خود ہی سینڈویچ لکھ دیا تھا۔

اس کی تیز بھوری آنکھیں ایک لحظے کے لیے سیاہی مائل سی ہوئیں۔ پیشانی پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا۔ 90ء کے ہیروز کی طرح اس نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا وہ کرا سے گھورا اور پھر وہ ٹوئٹ کے ہیرو کی طرح اسے مکمل نظر انداز کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے کہا نا اگلے ہفتے سے پہلے میرے پاس نہ آنا۔" وہ لائبریری بلڈنگ سے باہر نکلا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ بھی اس کے ساتھ نکلی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کانڈ کھینچا اور تیزی سے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے لپکی کہ وہ کینٹین جارہا ہے۔ لیکن وہ تو وہ تو۔

"یہ کیا ہے اقصیٰ؟ اس نے دو انگلیوں میں انگلیا کانڈ اقصیٰ کے آگے کیا۔ کس بھوکی کو میرے پیچھے لگا

دیا ہے۔"

"یہ کیا ہے؟" امرجہ نے اس امر کی نقوش کے حامل۔ فریج غصے کو سہم کر دیکھا۔ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔ اتنے دھڑلے سے۔ امرجہ نے اس پاس دیکھا۔

اف۔ یونیورسٹی کے سارے اسٹوڈنٹس اٹکھٹے لہرا لہرا کر شرم کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ پہلے تو امرجہ نے آنکھیں میچ لیں۔ پھر اس نے غصے سے بھڑک کر اسے دیکھا۔ اقصیٰ نے پڑھا کانڈ پر سینڈویچ لکھا تھا۔

"ٹوئیٹ می بیک پلیز۔" اقصیٰ نے اس کی عزت رکھ لی۔

"اگلے ہفتے۔" اس نے شان سے کندھے اچکائے۔ جیسے ایک برا نقصان کرنے کے بعد اطالوی اچکاتے ہیں۔ بے نیازی سے بھی اور خونخواری سے بھی۔

"تم دونوں ہینڈل کر لو پلیز۔" اقصیٰ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک بھوکے اور دوسرے کنجھلے کو کیسے ہینڈل کرے اور وہ کہہ کر گراؤنڈ سے اٹھ کر چلی گئی۔

"اگلے ہفتے سے ایک بھی دن پہلے میرے پاس نہ آنا۔" لپے کانوں والے نے ناک پھلا کر کہا اور پھر سے لائبریری کی طرف جانے لگا۔

"اگلے ہفتے تک میں مر جاؤں گی۔" وہ پھر اس ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"ایک میری ہی ٹوئیٹ پر زندہ ہو گیا؟" وہ پھر سے ایک فریج بن گیا جو غصے کو دبانے کے لیے لفظ چباتے ہیں تو آنکھیں سر دھری سے اندر کر لیتے ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ، لیکن وہ اس کے اس طرح خم دے کر طنز جھارنے پر اسے دیکھتی رہ گئی۔ غصہ کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ کیسی بات تھی۔

"آج تو اسی ٹوئیٹ پر رہنا ہے۔ سارے پیسے ختم ہو گئے اور نوڈلز بھی۔ صبح جلدی کی وجہ سے چائے بھی نہیں پی۔" اس بات پر وہ ذرا رک اٹے کرا اس بیک کو اپنی گردن سے نکال کر اسے کھنگالنے لگا۔ تھوڑا وقت لگا۔ لیکن وہ مطلوبہ چیز نکال چکا تھا۔

اف۔ اس نے ایک چاکلیٹ نکالی جو آجی کھائی ہوئی تھی۔

"یہ لو۔" آجی کھائی چاکلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"اس سے کیا ہو گا۔" چاکلیٹ دیکھ کر امرجہ کو خوشی تو ضرور ہوئی۔ لیکن فی الحال اسے سینڈویچ ہی کھانا تھا۔

"کافی کیلوریز ہیں اس میں۔" بھوری آنکھوں والے نے بیک کو واپس گلے میں ڈالا۔ ایک ہاتھ جینز کی جیب میں ڈالا اور ایسے کھڑا ہو گیا جیسے اس کا فوٹو سیشن ہو رہا ہو۔

"لارڈ میسر جوانی کے دنوں میں یونیورسٹی میں چیری کرتے ہوئے۔" فوٹو کا کپشن اس سے بڑھ کر اور کیا ہوتا۔

"مجھے کیلوریز نہیں چاہئیں۔ کھانا چاہیے۔"

"تو یہ کیا بھوسا ہے؟" لارڈ میسر نے بھنوں اچکائیں اور کچھ ایسے اچکائیں کہ وہ پیشانی پر گرے بھورے بالوں سے جا ملیں۔

"اور یہ چھوٹی۔" بھی ہے۔ چھوٹی اور آجی کھائی ہوئی اور پھر میں کیوں کسی کی چیز کھاؤں۔

بھنوں۔ اس بار سوالیہ اچھلیں۔ یعنی اتنی ایگو ہے تم میں۔ اچھا۔ سچ میں؟

دوسری طرف سے کھالوں۔ آخری کنارہ پھینک دینا۔

وہ منہ بنائے کھڑی رہی۔ اس نے پھر سے۔

بیک کھنگالا اور ایک پیکٹ نکالا۔ جس کے سپر کو ایک کاسن پن سے بند کیا گیا تھا۔ تاکہ اندر موجود میوہ جات بیک میں بکھرنے جائیں۔ پیکٹ بسکٹ کا لگتا تھا۔

"یہ لو اور یہ بھی لو۔" چاکلیٹ اور بسکٹ دونوں اس کے آگے کیے۔ اس نے دونوں پیکٹ پکڑ لیے۔

ایک میں موجود چاکلیٹ تو اس نے دیکھ لی تھی۔ دوسری کی بن نکالی تو وہ بسکٹ کا چور نکلا۔

"مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ چیری کر رہے ہو۔"

امرجہ بری طرح سے برا مان گئی۔ لیکن اس نے جیسے سنا نہیں اور وہ تیزی سے لائبریری کی طرف جانے لگا۔

”چھا۔ صرف کہانی۔ مطلب کرایہ نہیں لیں گی؟“

”ہاں۔ کرایہ تو ضرور لیں گی۔ ساتھ کہانی بھی۔“

”ٹھیک ہے، میں دو چار کہانیاں یاد کر کے جاتی ہوں۔“



شئل کا کاپتا لے کر وہ چھٹی والے دن شام کو آئی۔ یہ ایک دو منزلہ برطانوی طرز تعمیر کا کافی بڑا گھر تھا۔ گھر کے آگے سبزے کا کافی بڑا قطعہ تھا۔ جس میں مختلف اقسام کے پودے اور پھول لگے تھے۔ ساری عمارت سفید رنگی تھی اور وائنٹ ہاؤس کا چھوٹا سا نمونہ لگ رہی تھی۔ امرتہ کو شئل کا کافی بڑا قطعہ بہت پسند آیا۔ بلکہ بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ اگر اسے یہاں رکھ لیا جائے تو وہ کافی شاندار قسم کی رہائش گاہ ثابت ہونے والی تھی۔

نیل دی اور کافی دیر تک دیتی رہی۔ کھڑکیوں سے بھی جھانکتی رہی۔ دروازہ بھی بجایا۔ لیکن کوئی بات نہیں بنی۔ وہ دروازے کے پاس ہی بیٹھ گئی کہ شاید مالکن بازار تک گئی ہوں۔ کوئی بیس منٹ بعد جا کر دروازہ کھلا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے تک آئی۔

”مجھے کہانی آتی ہے۔“ جھٹ کہا۔

سامنے والی کی ہنسی کا فوارہ نکلا۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں تھی۔ لمبی پتلی، سنوٹی سی۔ کالے سیاہ بالوں کی کس کر چوٹی بنائے ہوئے اور انہیں کندھے پر گرائے ہوئے۔

”مجھے کمرہ چاہیے۔“

”اندر آ جاؤ۔“ وہ ہنستی ہوئی اندر کی طرف بڑھی۔

امرحہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگی۔

بعد ازاں امرحہ کو معلوم ہوا کہ وہ لینڈ لیڈی کو شام کی چائے پلا رہی تھی۔ پھر ان کا منہ دھلایا، کپڑے تبدیل کروائے۔ نیل دینے والا دروازہ پینٹنے والا جائے بھاڑ میں، ہم کیا کریں۔ لینڈ لیڈی نشست گاہ میں

جو دونوں پیکٹ ہاتھ میں لیے کھڑی ہے۔ اسے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ لیکن جو جاچکا ہے کیا اسے جانتے ہیں؟

عالیان مارگرٹ۔ وہ اپنی ماں کے نام کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔



رہائش کا مسئلہ تھوڑا سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ جو رہائش مل رہی تھی وہ مہنگی تھی، جو سستی تھیں یا وہ دور بہت تھیں یا وہ لڑکوں کے ساتھ تھیں۔ یعنی لڑکے لڑکیاں ایک ہی فلیٹ میں۔ سب اس کے لیے اپنی اپنی جگہ پر کوشش کر رہے تھے۔ وہ ایک دو برطانوی یا آسٹریلین ہندوستانی گھرانوں میں بھی گئی، لیکن وہ رہائش بھی اس کی گنجائش سے زیادہ تھی۔ وہ بہت نارمل سی ایک رہائش افورڈ کر سکتی تھی۔ یعنی بے حد سستی سی۔ جتنی زیادہ سستی ممکن ہو سکے اتنی سستی اور یونیورسٹی کے پاس بھی۔

”ایک لینڈ لیڈی ہیں تو، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کم ہی لوگ رہنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ ان کو سمجھنا بہت مشکل ہے وہاں جا کر دیکھ لو شاید تم ان کو سمجھ سکو۔“

”ٹھیک ہے وہاں بھی جا کر دیکھ لیتی ہوں۔“ اس کا منہ لٹک گیا۔

”ہاں۔ ایسے ہی منہ لٹکا لینا۔ اور وہ اپنا مشہور زمانہ اور آزمودہ فقرہ ضرور کہنا۔ منحوس ماری۔ مجھے تو جل مر جانا چاہیے۔“ اس بات پر وہ نوال سے زیادہ ہنسی۔

”ایک دو لڑکیاں ہیں جو وہاں گئی تھیں۔ ایک چند دن بعد ہی واپس آئی اور ایک نے چند ہفتے بعد وہ گھر چھوڑ دیا۔ وہ اسے شئل کا کہہ رہی تھیں۔“

”نام اچھا ہے شئل کا۔“

”کہانی آتی ہے تمہیں؟“

”ہاں۔ ایک دو آتی ہیں۔“

”گنڈ سنا ہے وہ ہر رات کہانی ضرور سنتی ہیں۔“

لنڈے آتش دان کے پاس بیٹھی بال چیریل کا انگلش زچہ بڑھ رہی تھیں۔ اس کی سانس اٹکنے لگی۔ یعنی شاعری بھی سنائی پڑے گی۔ وہ بھی ایسی اعلیٰ پائے کی۔ یعنی یہاں بھی اس کا کام بننے والا نہیں تھا۔ بہت دیر اس کا انٹرویو ہوتا رہا۔ وہ بہت صبر سے اور اپنی طرف سے بہت چالاکی سے سارے سوالات کے جوابات دیتی رہی۔

”کھانا پکالتی ہو؟ کیا کیا پکالتی ہو؟“

”چاول۔ روٹی۔ اور شور ہو تو نان بھی لگالتی ہوں۔“ اس نے اس چیز کا نام لیا جو برطانیہ میں میسر ہوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ ”تنور“

”میں کی روٹی۔ آلو۔ گو بھی۔ قہیے کے پرائٹھے۔“

”نان پر میں لگا کر اسے تل لیتی ہوں۔ بہت مزے کا بنتا ہے۔ آلو کے پکڑے۔ ٹینگن، بالک، پکن کے، مچھلی کے بھی بنالتی ہوں۔“

لینڈ لیڈی اپنے بچوں کے سے چھوٹے چھوٹے ہاتھ تھوڑی تلے رکھے اسے دیکھتی رہیں۔

”ہو چکا تمہارا؟ اب بتاؤ کھانا پکالتی ہو؟“

اس کا منہ لٹک گیا۔ اس کی چالاکی کسی کام نہ آئی۔

”واہی ٹھیک کہا کرتی تھیں کہ انسان کو زندگی میں سب کام آنے چاہئیں۔ نامعلوم زندگی کہاں لے جائے اور کون سا سیکھا کام۔ کام آجائے۔“

”گوشت کا سالن۔ اور چاول۔ بس۔ روٹی بھی۔“

”سادھنا، یہ پرائیڈوں کی اتنی ذرا سی کام کی ہے؟“

”جی۔ ہفتے میں دو بار یہ ہو جائے گا۔ باقی گوشت کا سالن اور چاول۔“

”مڈم سادھنا اسی کے ساتھ سونے پر ذرا کنارے پر بیٹھی تھیں اور سو میز بن رہی تھیں۔“

”سودا سلف بھی لانا ہو گا۔“

”جی۔ میں لے آؤں گی، سنڈے کے سنڈے۔“

”سنڈے وینڈے ہم نہیں جانتے۔ جب جب سادھنا کہے گی گانا ہو گا، تازہ سبزی آتی ہے روز۔ حال گوشت آتا ہے۔ بولو ہاں یا نا؟“

”ہاں جی۔ ہاں۔“

”گنڈ۔ اچھا اب بولو کہانی آتی ہے کوئی؟“

”جی آتی ہے۔“

”گنڈ۔ کون کون سی؟ سناؤ ذرا۔“

”ایک کوا تھا بہت پیاسا تھا۔ ادھر اڑا۔ ادھر اڑا۔“

”دوسری۔؟“

”دوسری۔ خرگوش اور کھوے والی۔“ سادھنا

تیزی سے سلائییاں چلانے لگی، تاکہ اس کی ہنسی کم سے کم اس کے منہ سے نکلے۔ لینڈ لیڈی البتہ ہونٹ پیچھے نیچھی رہیں۔

”کی بی! یہاں رہنا ہے یا نہیں؟“

”رہنا ہے۔“

”تو کہانیاں بدلو۔“

”میں اچھی اچھی کہانیاں لے لوں گی۔ آپ کو پڑھ پڑھ کر سناؤں گی۔“

”گنڈ۔“

”کرایہ بتا دیں پلیز۔“

”پہلے شرائط سن لو۔ تم سے پہلے تین لڑکیاں ہو کر جا چکی ہیں۔ تم جو بھی آتی ہو۔ سادھنا یہاں دو سال سے رہ رہی ہے۔“

اس نے شہم کر سادھنا نامی ”ٹوکی“ کو دیکھا۔

”ہائے میری بھی اتنی عمر لگتی ہے کیا؟“

”سادھنا سے پہلے یہاں چھ لڑکے رہ کر گئے ہیں۔“

”ابجھے لڑکے تھے، سارا کام کر دیتے تھے۔ میں تو لڑکوں کے حق میں ہی تھی۔ پر اب سادھنا کی وجہ سے لڑکیاں ہی رکھتی ہوں۔ سارے گھر کی صفائی کرنی ہوگی اور صبح ہی کر کے جانی ہوگی۔ باقی کے کمرے بند ہیں۔ اور جتنا بھی گھر استعمال ہو رہا ہے۔ وہ تمہیں صاف کرنا ہو گا۔ کھانا بنانا ہو گا۔ ہفتے میں دو دن پودوں کی کانٹ چھانٹ۔ اور کھڑکیوں کی صفائی۔ ایک ہفتے تم میرے کپڑے لائڈری کر دو گی اور استری بھی۔ ایک ہفتے سادھنا کرے گی۔ جتنی زیادہ لڑکیاں یہاں رہنے کے لیے آجائیں گی۔ اتنا ہی کام کم ہو جائے گا۔ میرے کمرے کا جو سینٹرل کارپٹ ہے اسے دھوپ کے

دنوں میں تمہیں دھوپ لگوانی ہوگی۔ پاکستان میں اپنے گھر کا نمبر تمہیں مجھے دینا ہوگا۔ کیونکہ اگر میں نے تمہیں ٹریک سے اترتے ہوئے دیکھا۔ یعنی اگر تم میں کوئی غلط حرکت دیکھی تو فوراً میں تمہارے گھر والوں کو بتاؤں گی، تم ایک مسلمان لڑکی ہو، اس لیے میں تمہارے پاس کوئی ایسی دسی چیز نہ دیکھوں ورنہ میں تمہیں فوراً یہاں سے نکال دوں گی اسی وقت۔

چاہے باہر برف باری ہو رہی ہو اور تم نمونہ کا شکار ہو۔ تمہارے ہر طرح کے دوست یہاں آسکتے ہیں، لیکن اگر میں نے ان دوستوں میں خرابی دیکھی تو بھی تمہیں یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ بے شک تمہیں پورے انگلینڈ میں کہیں جگہ نہ ملے۔ اگر میں سوتی ہوں تو چٹکی کی آواز سے بھی اٹھ جاتی ہوں۔ اس لیے جب میں سوؤں تو تم ایسے ہو جانا جیسے گولی ہو۔

لینڈ لینڈ بولتی رہیں۔ بولتی رہیں۔ وہ جس صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی پر اونٹن گئے۔ کوئی تین گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی صوفے پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کی نظر چھت پر لگے بڑے سے فانوس پر گئی جو روشن تھا۔ لیکن اس کی نیند سے بھری آنکھیں اس فانوس میں سے مختلف رنگ نکلتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ رنگ اڑ رہے تھے۔

”کیا مجھے کسی ڈان نے اغوا کر لیا ہے۔“ چھت اور تد آدم کھڑکی کے قد آدم ہی پردوں کو گھورتے اس نے سوچا۔

”میں یہاں ہوں۔ کہاں ہوں۔ میں۔؟“ وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھی سادھنا لینڈ لینڈ کی راکنگ چیئر کے پاس صوفے پر بیٹھی کہانی سن رہی تھی۔ اسے لگا وہ صرف بائچ منٹ ہی سوتی ہے۔

”اور کیا گیا کہہ رہی تھیں آپ؟“ وہ آنکھیں ملنے لگی۔

”تم ایسے ہی ہر جگہ لم لیٹ ہو جاتی ہو لڑکی؟“ لینڈ لینڈ ہنس کر بولیں۔ امرجہ لفظ لم لیٹ پر حیران ہوئی۔ خالص دسی لفظ تھا۔ یقیناً ”کوئی پاکستانی سکھا کر گیا تھا انہیں۔“

”جی۔ بس۔۔۔ آج تھکی ہوئی تھی تو۔۔۔“

”جاؤ کھانا کھا لیں۔ لیکن میں رکھا ہے۔“

”کھانا؟“ جیسے صدیوں بعد یہ لفظ سنا تھا۔ وہ جلدی سے کچن میں گئی اور سارے ویجی ٹیبل رائس اور چکن سوپ ہرپ کر گئی۔ کافی بنائی اور مک لے کر آئی۔ لینڈ لینڈ اسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔

”کافی کس سے پوچھ کر بنائی تم نے؟“

”اوہ۔۔۔ پھر غلطی کر دی اس نے۔“ وہ خاموش کھڑی دونوں خواتین کو دیکھتی رہی اور منہ لٹکا لیا۔ شکل پر بے چارگی لے آئی۔

”بیٹھ کر پیو۔“ لینڈ لینڈ کے اعصاب کچھ ڈھیلے ہوئے۔ وہ بیٹھ کر پینے لگی۔

”برائے ماننا، بر تم ایسا والے بہت تنگ کرتے ہو۔ ایک لمبا وقت تو تمہیں بنیادی اخلاقیات سکھانے میں لگ جاتا ہے اور تم لوگ کھاتے بھی بہت ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، پر تھوڑا اپنی عادات پر قابو پاؤ، انہیں درست کرو۔“ امرجہ خاموشی سے کافی پیتی رہی۔

”تم جا کر سو جاؤ سادھنا۔ اور تم امرجہ! مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔“ وہ انہیں کمرے تک لے گئی۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھیں۔ دائیں ٹانگ فالج زدہ تھی۔ دایاں ہاتھ بھی بہت مشکل سے حرکت کرتا تھا۔ لیکن ٹانگ کی طرح مفلوج نہیں تھا۔ انہیں ان کے بیڈ پر لٹایا۔ ”میرے بال بھی اتار دو۔“

”بال۔! امرجہ کو لگا، ان کے دماغ کے ساتھ بھی کچھ مسئلہ ہے۔“

”ہاں، بھی، آؤ تو۔۔۔؟“

وہ قریب ہوئی اور بالوں پر ہاتھ رکھ کر کھینچا اور وگ اس کے ہاتھ میں آگئی اور اندر سے بمشکل آدھ لہجے بال نکلے۔

پھر وہ سوچ بورڈ کی طرف آئی اگر اس نے ٹھیک سے گئے تھے تو وہاں کم سے کم پچیس سے زیادہ پن تھے۔ ٹائٹ بلب کا شید پند کرنے میں انہوں نے کافی وقت لیا۔ پھر ہلکے سرمئی کو انہوں نے اتار کی رات

سے لیے پسند کیا اور اسے جانے کے لیے کہا۔

”تم ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ، صبح اپنا سامان لے آؤ۔“ خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی۔ کیونکہ تین وقت کے کھانے کے ساتھ یہ جگہ اسے بہت ہی سستی دیتی تھی۔

”اور ہاں۔ دوبارہ کچن میں نہ جانا۔“ لیکن وہ پہلے کچن میں گئی۔ ایک کپ اور کافی بنائی اور ایک کپ کافی کی قیمت کچن کاؤنٹر پر رکھ دی اور کمرے میں آکر سو گئی۔ درمیان میں اس کی آنکھ کھلی تو اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس نے فوراً ”شری کو فون کیا۔“

”میں پولیس کو کال کرنے ہی جا رہی تھی، تم نے ہمیں پریشان کر دیا۔“ وہ ابھی اتنی ذمہ دار نہیں ہوئی تھی۔



اگلے دن سامان لا کر اسے کمرے میں سیٹ کیا۔ پھر اس دن سنی ڈے تھا، تو کارپٹ کو اٹھا کر دھوپ میں ڈال دیا۔ کپڑے دھوئے، استری کیے، پھر انہیں لینڈ لینڈ کی وارڈروب میں لٹکایا۔ سادھنا کے ساتھ مل کر کھانا بنایا اور پھر کینے آگئی۔ واپسی پر یک اسٹور ہوئی گئی۔ لینڈ لینڈ وہاں اردو کی کتابیں بہت کم تھیں جو تھیں وہ بہت ادبی تھیں۔ زیادہ تر شاعری کی تھیں۔ آگ کا دریا خدا کی ہستی، لو اس فلسفے، من چلے کا سودا، وغیرہ وغیرہ۔ ایک تو وہ فی الحال اس طرح کی مہنگی کتابیں خرید نہیں سکتی تھی۔ دو پھر اس عمر میں اپنے سر کے بال جھڑوانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سب کتابیں پڑھ چکی تھی۔ لیکن پڑھ کر سنا نہیں سکتی تھی۔ یہ ایک صبر آزما کام تھا اور اتنا زیادہ صبر وہ اتنی سی عمر میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ایک سادہ سی۔ سستی سی کتاب چاہیے تھی۔ اس نے اپنی پاکستانی ہم جماعت سے بات کی تو اس نے اسے اپنی خالہ کی ایک کتاب لادی۔ کھیل تماشا۔ اشفاق احمد کی۔ خیر ایک تو مفت میں کتاب مل گئی تھی۔ دو سرائیادہ مونی نہیں تھی۔

اپنی باری پر اس نے لینڈ لینڈ کو کھیل تماشا سنانا

شروع کی وہ تو مزے سے سنتی رہی۔ لیکن امرجہ کے دماغ کے کہیں اوپر سے الفاظ گزر گزر کر جاتے رہے۔ وہ بلاشبہ اپنی طرز کی شاہکار کتاب تھی۔ لیکن امرجہ جیسے کند ذہن اسے بے کار بنا رہے تھے۔ لینڈ لینڈ اسے بار بار پچھے لے جاتیں۔ کئی کئی سطروں کو بار بار پڑھواتیں۔ اتفاق سے اس نے ایک بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔ ”کھیل تماشا“ نے سننے والے اور سنانے والے دونوں کا دل موہ لیا تھا۔ تخت بور کے ماسٹریالی اور ان پر مرٹنے والی رجینی نے نشست گاہ میں جاو سا جگا دیا ہوتا جیسے۔ ایسے لگتے لگتا جیسے ماسٹریالی اپنی کلارنٹ پر آسا کی وار ان کے سامنے بیٹھے ہی بجا رہے ہوں۔ اور رجینی عین ان کے سامنے داسی بنی بیٹھی ہو۔

لینڈ لینڈ مہر نہال ہو، ہو گئیں۔ ”بہت کمال کی۔ شان دار۔“

سادھنا قدیم بنگالی اور بھوج پوری لوک کہانیاں سناتی تھی جو اس نے اپنے بنگالی باپ اور بھوج پوری ہاں سے سنی تھیں اور حیرت انگیز طور پر وہ کہانیاں اتنی تھیں کہ امرجہ کو لگتا سادھنا نے اپنی زندگی کے اتنے سال صرف کہانی سننے ہی گزارے ہیں۔ جب وہ رات کو کہانی شروع کرتی تو اس کی آواز میں سارے بنگال کا سحر سمٹ آتا۔ وہ کنگ جمن کی طرح رواں دواں ہو جاتی۔ ہلکورے کھاتی۔ شفاف ہو ہو جاتی۔ اکثر اس کی کہانیاں پر سوز ہوتا۔ لیکن وہ انہیں اتنی نرمی اور چاہت سے سناتی کہ لگتا ہی نا کہ ان کہانیوں میں سوز ہے۔

سادھنا بمشکل بتیس سال کی تھی اور اس کے آٹھ سالہ بیٹے کو بیڈیوں کا کینسر تھا۔ سادھنا کی کہانی محبت سے شروع ہو کر امرجیت پر ختم ہوتی۔ وہ پر سوز کہانی سناتے ہوئے بالکل ابدیدہ نہ ہوتی، بلکہ ایسے لگتا کہ اس کا آٹھ سالہ بیٹا اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے۔

”جو دکھ پر رو رہا ہے۔ وہ تو پھر کوئی انسان ہوا، لیکن جو کم بہتی پر رو رہا ہے۔ وہ بھی کوئی انسان ہوا۔؟“ وہ بھی

کوئی انسان بھلا۔

تو سادھنا کیونکر روتی، جب اس کا بیٹا ہی جو اس حوصلہ سے ساری تکلیف نہ کر بھی اسے فون کرتا ہے اور کہتا ہے۔

”میں جب تک زندہ رہوں گا۔ کبھی رو کر نہیں سوؤں گا۔ کبھی رو کر آنکھ نہیں کھولوں گا۔ ڈاکٹروں کے سارے اوزار اور ان کی دوا میں۔ اور میرے جسم کی ساری تکلیف بھی مل کر مجھے ہرا نہیں سکے گی۔ میں نہیں روؤں گا۔ کبھی نہیں۔“

تو ایسے بچے کی ماں کیسے روتی۔ وہ بات بات پر مسکراتی۔ ہنستی۔ اس کی کہانیاں کیوں نہ ”مر جیت“ ہوتیں۔ اس کی آواز میں ایسا سحر کیوں نہ آتا جو تھپک تھپک کر سلاوتا ہے دل پر کیسا ہی بوجھ کیوں نہ ہو۔ اس کی کہانی پرستان لے ہی جاتی ہے۔ سادھنا کی کہانی سنتے سنتے وہ نشست گاہ میں ہی سو جاتی جیسے کوئی وہ لوری سنا تا ہو جو جنگ سے لوٹ آنے والا اپنے بچوں کو اور جنگ جیت جانے والا اپنے کنبے کو سنا تا ہے۔ وہی جوان مردی کے قصے اور شہیدوں کے لہو رنگ فسانے۔

اس دوران ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جو کافی بڑی صورت اختیار کر گیا۔ اسے اور اس کے چند کلاس فیلوز کو یونیورسٹی کے ایک دوسرے گروپ نے اپروچ کیا۔ وہ مائیکسٹر میں اپنی نئی کلاسز کے شروع ہونے کے سلسلے میں ایک پارٹی کا اہتمام کر رہے تھے۔ اور پارٹی کے انتظامات کے لیے انہوں نے یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو بھی موقع دیا تھا۔ تاکہ وہ چند گھنٹوں میں کچھ زیادہ پونڈز کمائیں۔ اس کے کلاس فیلوز نے ہاں کہا تھا۔ اس نے بھی ہاں کہہ دیا۔ انہیں پارٹی کے سارے انتظامات دیکھنے تھے۔ ڈیکوریشن سے لے کر سرونٹ تک۔ پارٹی ان میں سے کسی ایک اسٹوڈنٹ کے گھر کے لان میں تھی اور جہاں یہ گھر تھا۔ وہاں باقی گھر کافی دور دور تھے۔ جن کے آگے سڑکیں کھلی اور

کشادہ تھیں۔

سرشام ہی ان سب نے پارٹی کے لیے ابتدائی میٹنگ مکمل کر لی۔ باقی ان کا کام میزوں پر کھانے کی اشیا رکھنا تھا جو ذرا ہٹ کر الگ سے رکھی تھیں۔ انہیں ہر فرد کو الگ الگ نہیں پیش کرنا تھا۔

”تم شکل سے بہت زیادہ پاکستانی لگتی ہو۔“ ایک اور اس کے دوسرے دوست اسے تشویش سے ایسے دیکھنے لگے کہ اسے تشویش ہونے لگی۔ وہ سب پارٹی کے انتظامات دیکھنے آئے تھے۔

”میں ہوں بھی پاکستانی۔“ وہ برومان لگتی۔

”نہیں۔ ہمارا مطلب۔ وہ سب ذرا ڈرتے

ہیں۔ ذرا اسے کچھ زیادہ ہی ڈرتے ہیں۔“

”ڈرتے ہیں۔ کون۔؟“

”آج کی پارٹی میں آنے والے زیادہ تر

اسٹوڈنٹس۔“ وہ کافی زیادہ گول مول سی باتیں کر رہا تھا۔

”میں پاکستان فوٹا ہے کیا؟“

”نہیں۔ شاید ہاں۔ یہ اخبارات۔ ٹی وی۔

میڈیا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ برا نہ مانو پلیز۔ وہ

کمزور عقیدے کے لوگ ہیں۔ جو کچھ اخبارات میں

کہا جاتا ہے اس پر یقین کر لیتے ہیں اور تم ہو بھی

مسلم۔ پلیز ایسے برا نہ مانو۔ دھماکوں سے بہت ڈر لگتا

ہے انہیں۔“

”دھماکوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں مسلم ہوں۔

آخر کیا مطلب ہے ان سب باتوں کا۔ مجھے بھی

دھماکوں سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن میں تو تمہیں نہیں بتا

رہی۔“ وہ ایک نہ سمجھ سکی۔

”دیکھا تم برا مان گئیں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔

یہاں کون سا دھماکا ہونے جا رہا ہے۔ مطلب کچھ ہوگا

ہی نہیں تو ڈرنا کیسا۔؟“

”کچھ ہونے کا خطرہ ہے یہاں۔ کوئی بلاسٹ؟ تم

مجھے ڈر رہے ہو؟“

”میں تمہیں صرف بتا رہا ہوں۔ ان میں سے زیادہ

تر کے انکل اور فادرز پولیس میں ہیں۔ بس ایسے ہی بتا

رہا ہوں۔ ایسے پریشان نہ ہو۔“

امرحہ کا سر چکرانے لگا۔ ”کیا کہہ رہے ہو۔ کیا

بھجانا چاہ رہے ہو مجھے؟“

”ایسے ہی تم سے باتیں شیر کر رہے ہیں۔“

”ایسے باتیں شیر کرتے ہیں۔ تم سب مجھے شک

سے گھور رہے ہو۔ تمہیں لگتا ہے میں یہاں دھماکا

کروں گی۔ میں۔ کیا لائق ہے یہ۔؟“

”ایسی تو کوئی بات ہم نے نہیں کی۔ تم کیا سے کیا

سوچ رہی ہو؟“

”ہاں سیدھے سیدھے یہ بات نہیں کی پر جو کی

ہیں ان کا مطلب خوف ناک ہے۔“

”ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تمہارا تو ابھی سے

رنگ اڑ گیا ہے۔“

”ابھی سے مطلب۔“ اس کا رنگ واقعی میں اڑ

اڑ گیا۔

”وہ گڑبڑا گئے۔“ مطلب ہم تو صرف باتیں کر رہے

ہیں۔“

”ایسی خطرناک باتیں ہی کرتے ہو تم سب؟ مجھے

تمہاری باتیں پسند نہیں آئیں۔“

وہ اپنے کام میں لگ گئی اور اندر ہی اندر سم بھی

گئی۔ یعنی اگر ذرا سی بھی کوئی گڑبڑ ہو گئی تو یہ لوگ اس

پر صاف صاف الزام لگادیں گے۔ پولیس اور پھر

لان میں ایک طرف اونچائی پر ڈی۔ جے کا انتظام

کیا گیا تھا۔ جیسے کلب میں ہوتا ہے۔ اندھیرا گہرا ہوا تو

ٹوئسٹ لائٹس نے اور Twist بڑھا دیا۔ انہوں

نے ڈی جے ساؤنڈ چیک کیا جو خطرناک حد تک تیز

تھا۔ نیلی پیلی ہری لال ٹوئسٹ لائٹس حرکت کرنے

لگیں۔ سب آنے لگے۔ انہوں نے میزوں پر پہلے

سے ہی سوٹ ڈر نکس رکھ دی تھیں۔ دو گھنٹے بعد

انہیں کھانے کی چیزیں رکھنی تھیں۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دوسرا بھی گزر گیا۔ ان سب

نے مل کر میزوں پر کھانے کی اشیا رکھ دیں۔ ڈی جے

جے نسبتاً ہلکی آواز میں میوزک کے ساتھ تجربات

کرتا رہا۔ جو امرحہ کو کافی پسند آئے۔ وہ گلاسوں کی

ثرے رکھتے جاری تھی کہ ایک نے اسے آواز دی۔

وہ اس کے قریب جا ہی رہی تھی کہ ایک زوردار دھشت

ناک دھماکا ہوا۔ اتنا زوردار کہ کانوں کے پردے بھٹنے

کے قریب ہو گئے۔ امرحہ بری طرح سے لڑھک کر

گری۔ اسی دھماکے کے ساتھ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں

اور چند انسانی چیخوں کی آوازیں بھی آئیں۔ پورے

ایک منٹ تک سنا رہا۔ امرحہ زندگی میں کبھی اتنی

خوف زدہ نہیں ہوئی تھی۔ جتنی اس دھماکے سے ہو گئی

تھی۔ وہ بمشکل ابھی اور اس پاس نظر دوڑانے کی

کوشش۔ دوسرے لوگ بھی کچھ اٹھ چکے تھے۔ کچھ

اٹھ رہے تھے۔ یہ ایک خوف ناک منظر تھا۔ اس لیے

نہیں کہ وہاں دھماکا ہوا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ سب

اسے گھور رہے تھے۔ اس نے جینز پر لمبی قمیص پہن

رکھی تھی اور ایک نے ہی کہا تھا کہ سر ڈھانپ کر کام

کرا ہے تو اس نے اسکارف کو سر پر اچھی طرح سے

اوڑھ لیا تھا۔

امرحہ کو پہلے یہ صرف اپنا دھماکا لگا کہ وہ سب ٹھنکی

باندھے اسے دیکھ رہے ہیں۔ پھر اس نے ذرا گردن

گھمائی تو۔۔۔ وہم لگنے والا خیال سو فیصدی

خوف میں بدل گیا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر جمے اسے

دیکھ رہے تھے۔ گھور رہے تھے۔

ان میں سے ایک نے ٹپکاتے ہونٹوں کے ساتھ

انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ یو۔ یو۔ ڈو۔ ڈو۔ (تم

نے کیا ہے یہ۔)

اس اتنی سی بات سے جیسے کسی نے اس کے سر پر

دوسرا دھماکا کیا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے

ذہن میں ٹائن الیون لندن ٹرن دھماکے، اخبارات ٹی وی

چیمنلز کی سب ہی خبریں۔ ڈاکومنٹریز۔ گنڈھوکر

چکرانے لگیں۔ دہشت گرد۔ یوڈ ڈن۔ دہشت

گرد۔ یو۔ یو۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ دہشت اس

کے چہرے پر نظر آنے لگی۔

”میں۔ مجھے نہیں معلوم۔“ وہ انک انک کر

ہونٹ ہلانے لگی۔ آواز اس کے ہونٹوں سے نکل ہی

نہیں رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری زندگی

بول ہی نہیں سکے گی اور ٹھیک اسی دوران ایک اور دھماکا ہوا۔ ویسا ہی زوردار۔ ان سب نے اپنے کالوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ وہاں موجود بہت ساری چیزیں گریں۔ شیشے کے چھوٹے ٹکڑوں کی ایک بوچھاڑ آندھی کی طرح آئی۔ پیچھے کھڑے بہت سے لڑکے لڑکیاں گر گئے اور کراہنے لگے۔ اس طرف کافی اندھیرا تھا۔ لیکن ان کی چیخیں اور کراہیں سنی جاسکتی تھیں۔ اس بار امرہ گری نہیں کھڑی رہی اور کافی دہشت ناک انداز لیے کھڑی رہی۔ ایک دم سے فضا میں پولیس سائرن اور فائر بریگیڈ سائرن کی آوازیں گونجیں۔ پیچھے کہیں سے زوردار آگ کے بھڑک اٹھنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

”اس نے ایک بم اپنے ساتھ بھی باندھ رکھا ہے۔“ کسی ایک نے چلا کر اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ سب سسم کر دور دور ہونے لگے۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب۔ یہ سب ایسے ہی ہو رہا ہے جیسے اسے نظر آرہا ہے۔ پولیس سائرن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کی نخواست کہ مائچسٹر میں ایک اسٹوڈنٹ پارٹی میں دھماکے ہو گئے۔ اور اس جگہ امرہ موجود تھی۔ کھڑے کھڑے اس نے کل کے اخبارات میں اپنی تصویر دیکھ لے۔ نی وی کی رپورٹنگ کا اندازہ کر لیا۔ عدالت میں خود پر کیس چلتے دیکھ لیا۔ اس کے حق میں چند ہزار مسلم ریلی نکال رہے ہیں اور عدالت اپنا فیصلہ سن رہی ہے۔ اس کے گھر والے اسے لعنت ملامت کر رہے ہیں۔ اور معصوم ہوتے ہوئے بھی اسے پور پور میڈیا دہشت گرد ثابت کر رہا ہے۔ اس کی پردھانی کا کیا ہو گا۔ اس کا کیا ہو گا۔ وہ تو مرجائے گی اور ٹھیک اسی دوران ایک اور دھماکا ہوا اور وہ حلق کے بل چلانے لگی۔ پاٹھوں کی طرح۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا۔“ ایک سیکنڈ میں وہ یہ بات بیس بار کہہ گئی ساتھ چلائی رہی۔ چار پانچ سو اسٹوڈنٹس کا گروپ اوہرا اوہر پھیلا اسے دیکھتا رہا۔

”من رہے ہو تم۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ پوری قوت سے چلائی۔ اپنی ساری ہمت جمع کر کے پورا زور لگا کر۔ وہ سب ویسے ہی کھڑے رہے۔ جیسے کوئی اسٹیج شو کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں۔

”تم۔ تمہارا میڈیا۔ تمہارے نی وی چینلز۔ اخبارات۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ پاگل ہو تم سب۔ پاگل بناتے ہو۔ دنیا کو ہم دہشت گرد ہیں یا تم۔ ہم نہیں تم ہو۔ تم نے دنیا میں فرسٹریشن کو بڑھایا ہے۔ تم ہو خرابی کی جڑ۔ اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں کہ تم مجھ پر الزام لگا کر مجھے اندر کروا دو۔ میں تم سب کو مار ڈالوں گی۔ دہشت گرد نہیں ہوں میں۔ نہیں ہوں۔“

پھر ایک دم سبزے پر بیٹھ کر وہ اپنی اونچی آواز سے رونے لگی۔ اور اونچی۔ اور اونچی۔ پولیس اور فائر بریگیڈ سائرن بند ہو گئے۔ پارٹی میں اب صرف اس کے رونے کی آواز ہی آرہی تھی۔ وہ سب جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ اب وہ ایسے کھڑے تھے جیسے بارر مودی دیکھ رہے تھے۔

”یہ سب تمہارے ساتھ پریکٹیکل جوک (عملی مذاق) کر رہے تھے۔“

آواز کچھ جانی پہچانی تھی۔ اس نے جھٹکے سے گردن اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس سے ذرا سا دور اندھیرے میں ایک کرسی پر عالیاں بیٹھا کاک ٹیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے یہ بات اتنے سکون سے کی جیسے وہ خاموشی سے بیٹھتا اور پیرا دیکھتا رہا ہو۔

”پریکٹیکل جوک۔“ وہ کئی لحظے سنائے۔ میں ہی رہی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس حد تک کوئی عملی مذاق بھی کیا جاسکتا ہے۔

”تیسرے دھماکے کے بعد انہوں نے تمہیں خود ہی بتا دیا تھا۔ یہ سب سینئرز ہیں اور جوئرز کے۔“

”شٹ اپ۔“ اس نے دھاڑ کر انگلی اٹھا کر عالیاں سے کیا۔ پھر وہی انگلی لہرا کر اس نے وہی شٹ اپ پوری قوت سے چلا کر ان سب سے کہا۔

”تم لوگ۔ انگریز۔ گورے۔ دنیا پر حکمرانی

کرنے والے۔ جو جی میں آئے کرنے والے۔ ہمیں غلام سمجھ رکھا ہے۔ جب جی میں آیا مذاق بنالیا ہمارا۔ جب جی میں آیا غلام بنالیا۔ کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں۔ پہلے ہمارے ملک میں آئے۔ ہم پر راج کیا۔ ہماری تذلیل کرتے رہے اور اب ہمیں دہشت گرد بنا رہے ہو۔ ہم سے حسد کرتے ہو کہ ہم زندگی میں آگے نہ نکل جائیں۔ تم سب سے آگے نہ نکل جائیں۔“

گالی اور گنتی کے لیے ہر انسان اپنی ماوری زبان استعمال کرتا ہے کہ مصداق وہ دوانی سے چیخ چلا کر اردو میں ان پر برس رہی تھی۔ عالیاں ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کرنا جا رہا تھا۔

”تم انگریز۔ گورے۔ ہمارے ملک میں آئے۔ ہم نے تمہاری میزبانی کی۔ تمہیں بادشاہ بنالیا۔ جاتے ہوئے تمہیں کوہ نور تحفے میں دیا۔“ عالیاں اپنی مرضی کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اسے اور بھڑکا رہا تھا۔ امرہ کہیں عالیاں سے نینے کا وقت نہیں تھا۔

”تم لوگ خود کو سمجھتے کیا ہو؟ کیا سمجھتے ہو تم خود کو ہاں؟ بہت بڑی توپ قوم ہو تم؟ تم ٹیک۔ شریف۔ پڑھے لکھے۔ اور ہم جاہل۔ گنوار۔ دہشت گرد۔ مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں۔ تم اور تمہاری گندی سیاست نے مل کر اسے دہشت گرد بنا دیا ہے۔ ایک نو مولود بچہ بھی دہشت گرد ہے۔ اگر وہ مسلمان ہے تو۔“

امرہ کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کے اس جلال کے عالم میں کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ بول سکے۔ یا اس کے قریب آ سکے۔ عالیاں خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی ترجمہ نہ کیا۔

”ٹرانسلیشن پلیز۔“ کسی کو نے سے آواز آئی۔

”جوک کرنے کے لیے تمہیں یہی جوک ملا تھا؟ خود تم نے گوانتا سوبے میں کیا کیا؟“

”وہ امریکی تھے عالیاں بولا۔“

”وہ ظالم تھے۔ اور ظالم کسی قوم سے نہیں ہوتا اور یہ سب بھی ظالم ہیں۔“ اس نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

آنسوؤں کا دریا اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔

”ٹرانسلیشن پلیز۔“ آواز پھر آئی۔ امرہ نے ایک قر آلود نظر سب پر ڈالی اور اس بار انگلیش میں بولی۔

”اس مذاق سے اگر میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔ اگر میں مرجائی۔ اتنا گھٹیا مذاق۔ تم لوگ اتنے ظالم ہو کہ مذاق بھی ایسا ظالمانہ سوچا۔ تف ہے تم پر۔ کتنے چھوٹے ہو تم سب۔ اتنی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتے اور یہ سب سیکھتے ہو۔ گندے ہو تم۔ جاہل۔ تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ مرجاؤ سب کے سب تم۔ اتنے پونڈز تم نے دھماکوں پر لگا دیے اگر وہی پونڈز تم۔“

”کوئی پونڈ نہیں لگا۔ وہ تو ایسے ہوئے ہیں۔“ ڈی جے نے ایک ٹین دیا اور ایک اور دھماکا ہوا، یعنی وہ ساؤنڈ چھوڑ رہا تھا۔ اللہ انہیں نظرد سے بچائے کس قدر ٹھنڈا تھا۔

”وہ سب۔ جو شیشے کی کرسیاں اڑ کر آئی تھیں۔ وہ ہارڈ کرسٹل شیٹ کی تھیں۔“ امرہ نے شدید غصے میں اپنے قریب ہی گرا ہوا ایک گلاس اٹھا کر اوپر ڈی جے کی طرف اچھالا۔

”انگلیاں ٹوٹ جائیں تمہاری ہمرے ہو جاؤ تم۔“

”ریلیکس۔ کافی ہو گیا۔ چلو اب بس کرو۔“

عالیاں نے نرمی سے کہا۔ اسے اور غصہ آیا۔

”تو اس بندر کھو اپنی۔“ اس کی آواز ڈی جے کے کیے دھماکے سے زیادہ دھماکا انگیز تھی اس بار۔ اس نے ایک نظر پھر سب پر ڈالی بے عزتی کے احساس سے اس کا سارا وجود جھلنے لگا اور جیسا کہ پہاں آنے سے پہلے وہ دھاڑیں مار مار کر روتی ہی رہی تھی۔ تو وہ سب ہی دھاڑیں اس کے اندر پھر سے جاگ اٹھیں۔ وہ گھاس پر بیٹھ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر ان سب دھاڑوں کو آواز میں جگا کر رونے لگی۔ سب نے دور سے ہی اس کے گرد گھیرا سا بنالیا۔ کسی میں اب اتنی جرات نہیں تھی کہ شیرینی بنی امرہ کے پاس آئے اور اسے چپ ہی کروائے۔ عملی مذاق تھا اور کچھ زیادہ ہی

عملی ہو گیا تھا۔ اب وہ رو رہی تھی اور وہ سب شرمندہ شرمندہ اسے سن رہے تھے۔ عالیان اٹھا اور چل کر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”مذاق کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ ان کی غلطی ہے۔ انہیں معاف کرو۔“ وہ بدستور ہنسیاں لیتی رہی۔

”پلیز۔ انہیں معاف کرو۔ پلیز۔“

اس نے سالوں تڑپ تڑپ کر پھپھپ چھپ کر روتی رہی۔ آنکھوں کو اٹھا کر عالیان کو دکھا۔ عالیان وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں دو آنکھوں میں اتنی تڑپ، تکلیف، دکھ اور غصہ سمٹا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سیاہ مشرقی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان مشرقی آنکھوں میں طیش و شکوے کے ایسے پادل نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسے شکایت سے دیکھ رہی تھی کہ اردو بولنے والا نام سے مسلمان کتنے والا وہ بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔

عالیان چپ کا چپ ہی رہ گیا۔ اس کی بھوری آنکھوں نے اس سے بھرپور شکایت کی۔ اسے انہیں ان دو سیاہ آنکھوں کے اتنے قریب نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ اب اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا انجام اسے ہی بھگتنا تھا۔ اکیلے۔

عشق مجازی کا اگر کوئی لاڈ کا نام ہوتا تو محبوب کی آنکھ کا طیش ہوتا اور اگر روتی ہوئی اندھیری آنکھوں کا کوئی لاڈ کا نام ہوتا تو وہ امرجہ ہوتا۔

عالیان کو یہ یاد کرنے میں دقت ہوئی کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دشواری اسے اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کے پانیوں میں غرق ان آنکھوں سے ہٹانے میں ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دو قدم پیچھے کو چلا اور پھر سے بھاگ بڑے جیسے انداز سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ماسٹر بالی کلارنٹ پر بسنت ہمارا بجا رہے تھے۔

اگلے دن وہ سب باری باری گھر آتے رہے اور دروازے کے پاس ہی پھول رکھتے گئے۔ رات اس نے

ان کا سوری قبول نہیں کیا تھا۔ ڈر کے مارے وہ اندر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی سب کا تماشا دیکھتی رہی۔ سب سے بڑا گلہ ستہ ڈرک کی طرف سے تھا یہ وہی تھا۔ جس نے امرجہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس ڈرامے کے لیے۔ پھر اسے ایک لمبا چارٹ ملا جس پر ان سب کے دستخط تھے اور چارٹ پر ایک روتا ہوا موٹے موٹے آنسو والا سوری لکھا تھا۔ چارٹ کے ساتھ ہی وہ ویڈیو بھی بھیجی گئی تھی جو کل رات بتائی گئی تھی۔ اس نے وہ ویڈیو دیکھی اور اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ واقعی۔ وہ ایک مکمل عملی مذاق تھا۔ ان سب کے تاثرات کمال تھے۔ اس نے وہ ویڈیو لیڈی مراد سادھنا کو بھی دکھائی۔ وہ لوٹ پوٹ ہوئی بار بار ویڈیو کو چلا کر دیکھتی رہیں۔

بعد میں اسے معلوم ہوا کہ کام کرنے کے لیے جتنے بھی لوگوں کا گروپ وہاں موجود تھا۔ ان سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ کیا جانا تھا۔ وہاں موجود سب ہی اسٹوڈنٹس مینجمنٹ یونیورسٹی میں پچھلے چار سال سے پڑھ رہے تھے اور یہ ایک روایت ہی تھی کہ وہ ہر سال کچھ نہ کچھ کرتے، لیکن امرجہ کے ساتھ مذاق کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا۔

اس واقعے سے اتنا ہوا کہ وہ یونیورسٹی میں کافی مقبول ہو گئی۔ اس کے کافی سے زیادہ دوست بن گئے۔ جو اسے دیکھ لیتا رک کر اس کا حال احوال ضرور پوچھتا۔ اسے کافی۔ لہجے کے لیے ہلاتے۔ کوئی نہ کوئی اس کی مدد کے لیے تیار رہتا۔ جو اسٹوڈنٹس مینجمنٹ کے ہی رہنے والے تھے۔ وہ اسے اپنے گھر شام کی چائے یا ویک اینڈ ڈنر پر مدعو کرتے۔ اس کے رونے دھونے کا ان سب فنکاروں پر ایسا اثر ہوا کہ اسے ننھی ننھی کی طرح ٹریٹ کرتے کہ بے بی چاکلیٹ کھاؤ۔ آئس کریم کھاؤ۔ اچھا یہ لو باری۔ چلو دلو لے لو۔ بس رونا نہیں۔

ایک وسیع حلقہ اسے جاننے لگا۔ وہ جس سے چاہتی بڑھنے میں مدد لے لیتی۔ اسی دوران ششل کاک میں ایک روسی ویرا اور ایک جلیانی این لون (Eun)

(Eun) آگئی۔ جلیانی تو بہت خاموش طبع تھی۔ سال میں ایک بار بولنے والوں جیسی تھی۔ اس نے لیڈی مرکو کہانی سنائی پر لیڈی مرنے سے اسے خود ہی روک دیا کہ وہ بس چپ چاپ گھر میں رہتی رہے۔ البتہ ویرا نے اپنے شہر سوچی میں ہونے والی بائیسویں سرکاری اولمپکس کی وہ وہ کہانیاں سنائیں کہ خود امرجہ کا جی چاہا کہ کاش وہ کوئی ایٹھلیٹ ہوتی۔ کاش فارس اوقات میں ویرا مینجسٹر کی سڑکوں پر دکھائی دیتی۔ اس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا۔ پال کمر سے بہت نیچے تک لمبے تھے یا سکاٹلینڈ کرنی یا اسکینڈنگ۔ جب وہ یہ دونوں کام کرتی تو لگتا کہ کوئی پری بنا پردوں کے سڑکوں پر پچی پرواز پر اڑ رہی ہے۔ اس کے پال جو اونچی پونی کی صورت میں بندھے ہوتے گھبراتے اڑتے۔ ایک بار ویرا نے اسے اسکینڈنگ شو پر سنا دیے اور امرجہ منہ کے بل سڑک پر گری، ٹاک کی ہڈی اتنی بچ گئی کہ بس سرجری کی ضرورت نہ رہی۔ باقی ساری کسر پوری ہو گئی۔ امرجہ کا بس کا کرایہ بھی بچاؤ وہ ویرا کے ساتھ ہی اس کی سائیکل پر بیٹھ کر یونیورسٹی چلی جاتی۔ لیکن ویرا کے ساتھ سائیکل پر بیٹھنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا رولر کوئسٹر پر بیٹھنا دل گردے کا کام تھا۔ کرایہ بچانے کے لیے وہ اپنے دل گردے روز مضبوط کرتی۔ وہ سائیکل پر ہزار ہزار کرتب کھاتی ہوئی جاتی۔ ویرا کچھ اخبارات کے لیے کالم لکھتی تھی۔ اس لیے اسے نوکری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ششل کاک ہاؤس میں چھوٹے موٹے مرمت کے کام آسانی سے کر دیے تھے۔ جس کی اسے لیڈی مرنے اجرت بھی دی۔ اس کا سر نہ میں ہلاتے امرجہ نے کم ہی دیکھا تھا۔ اسے جیسے سب ہی کام کرنے آتے تھے۔

ڈرک کی مدد سے اسے جوتوں کے ایک اسٹور میں کام مل گیا۔ اس کا کام مل رہا تھا۔ اس کا کام وہ کام تھا اور اس کی ہفتہ وار تنخواہ بھی اچھی تھی۔ ہفتے میں ایک بار وہ کیفے ضرور جاتی اور اپنے سابقہ پاس سے کافی کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی بات چیت کر کے آتی۔

اب تو داوی اور اماں بھی اس سے بات کرتے آہ

ویدہ ہو جاتی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی۔ اس نے پہلی بار داوی کو اپنے لیے آنسو صاف کرتے دیکھا۔ حماد اور علی اسے کافی تمیز سے مخاطب کرتے۔ دامیہ اسے خاندان میں ہونے والی تقریبات کی ویڈیوز بھیجتی رہتی جس میں اسے تو دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ سادھنا لیڈی مراد ویرا کافی شوق سے ان ویڈیوز کو دیکھتیں۔

ویسے تو موسم ابر آلود رہتا ہی تھا اور ہلکی پھلکی بارش بھی ہو ہی جاتی تھی۔ لیکن اس دن ہلکی لیکن مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ویرا کو کسی اخبار کے دفتر جانا تھا۔ اس لیے وہ اکیلی ہی آفس فورڈ سڑک پر واک کرتی ست روی سے چلتی رہی۔ اسے قطعاً جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہلکی ٹپکی عمارتیں۔ نم نم منظر اسے اچھا لگ رہا تھا اور بھلے سے وہاں کے مقامی اس موسم سے عاجز آچکے ہوں پر غیر ملکی خاص کر گرم ملکوں کے باشندوں کی جان تھی اس موسم میں۔ اس نے گہرے گلابی رنگ کے ویرا کے اسٹول کو گردن میں دوہل دے رکھے تھے۔ انہیں کھول کر اس نے سر پر اوڑھ لیا۔ پھر اس نے واپس گردن میں مل ہی دے دیے۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار سر پر پڑتی اچھی لگ رہی تھی۔ ایک دم سے پیچھے سے ایک ٹپکی چھتری جس پر گل لالہ کے پھول بکھرے تھے۔ اس کے سر کے اوپر تن گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر چھتری پکڑنے والے ہاتھ کو۔ وہاں عالیان کھڑا تھا۔

”تمہیں اپنی ٹویٹ واپس نہیں چاہیے۔ آج میں تمہیں برگر بھی کھلا سکتا ہوں اور کافی بھی۔“

”تی پرانی بات۔! انہیں کب نہیں چاہیے۔“

”کیوں۔ اب کیوں نہیں چاہیے؟“ چھتری بدستور وہ اس کے اوپر رکھے ہوا تھا۔ خود وہ بھگ رہا تھا۔

”تم سے نہیں چاہیے۔ تم بہت بد تمیز ہو۔“

”میں نے تم سے کب بد تمیزی کی؟“

”کب نہیں کی۔ ویسے تم مجھ سے اتنی نرمی سے کیوں بات کر رہے ہو؟“

”مجھے خود نہیں پتا چل رہا۔ میرا دماغ کھسکا ہی جا رہا ہے۔“

”علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں تمہارے پاس؟ ایسا کرو، علاج کی بھی ٹویٹ لے لو۔“

”علاج تو میں کروا لوں۔ لیکن اس بیماری کا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔“

”ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ کے ساتھ تم ایسی اونگی ہو گی باتیں کیسے کر سکتے ہو؟“

”اور یہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ بھی تو سب اونگا بونگا کرتی ہے۔“

”سب کیا۔؟“

”سب مطلب سب۔ وہ ہلکے سے مسکرایا اور یہ کرتے وہ ایسا لگا کہ امرجہ نے سوچا۔“

”کیا اس نے خدا سے اپائنٹمنٹ لی تھی۔“

”امرجہ نے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے دی۔ ”یہ کھاؤ تمہاری کیلوریز تیزی سے کم ہو رہی ہیں۔“

”تمہیں ڈراپ کروں۔“ وہ چاکلیٹ لے کر کھانے لگا۔

”تمہارے پاس گاڑی ہے؟“

”نہ۔ سائیکل۔“

”میں دیرانے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں بیٹھتی۔“

”میں گراؤں گا نہیں۔“

”پر میں تمہیں ضرور گراؤں گی۔ بھاگ جاؤ، میرا سرنہ کھاؤ۔“

”یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔“

”خاص تمہارے لیے۔“

”میرے لیے کچھ خاص۔ واقف۔ ٹھیک ہے۔ تم نے سینما دیکھے ہیں یہاں کے؟“ اس کے بھورے سر پر بارش کے قطرے لگن بیٹی کھیل رہے تھے۔

”ہاں! دیرانے کے ساتھ گئی تھی۔“

”اس نے یقیناً تمہیں ہنکر گیمز دکھائی ہوگی۔“

اس کا ماننا ہے کہ وہ جینیفر سے مشابہ ہے۔“

”لیکن وہ جینیفر سے زیادہ خوب صورت ہے۔“

”میں تمہاری کلاس فیلو جینیفر کی بات نہیں کر رہا۔ ویسے میں تمہیں ایک اچھی انڈین سوئی دکھا سکتا ہوں۔“

”میں انڈین سوئیرز نہیں دیکھتی۔“

”پاکستانی۔؟“

”وہ تین چار ہی ہیں۔ میں پاکستان سے دیکھ کر آئی ہوں۔“

”بنگالی۔؟“

”مجھے بنگالی نہیں آتی۔“

”میرانی۔ افغانی، تاجکستانی، ترکمانی، عراقی، مصری اور ہاں اپنی میٹھ۔ کیا تم نے کبھی سینما میں Animated فلم دیکھی ہے؟“

”نہیں۔“

”کیا تم نے Ratatouille دیکھی ہے؟ دیکھو اگر تم نے اتنی عظیم فلم نہیں دیکھی تو میں تمہیں پہلے اس کی کہانی سنا سکتا ہوں۔ دیکھنا خود تمہارا دل چاہے گا کہ تم فلم دیکھو۔ یہ ایک قابل ذکر جو ہے اور اس کے محسن کی کہانی ہے۔ چوہا جس کے ہاتھ میں مکمل کاڈا نقتہ ہوتا ہے اور وہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے شیٹ سے زیادہ اچھا اور لذیذ کھانا بنا سکتا ہے۔ ایسا کھانا جس کی کھانے والے کو نظیر نہیں ملتی اور ایسی ترکیب اور سلیقہ ہے۔“

”چوہا شیٹ ہوتا ہے؟ مطلب جو کھانا بنا تا ہے؟“

”ہاں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ کھانا بنانے سے پہلے ہاتھ دھوتا ہے۔ اس کے ہاتھ صاف ہوتے ہیں۔ بالکل تمہاری طرح۔“

”چوہا اور کھانا۔ آرخ۔ آرخ۔“ امرجہ نے سر کو زور زور سے جھٹکا۔ ”آرخ۔ آرخ۔ چوہا۔ اور میرے ہاتھوں جیسے صاف ہاتھ۔“ عالیان نے چھاتے کو بند کیا۔ اس کا ہاتھ تھک چکا تھا اور جلتے جلتے وہ رک گیا اور اسے بھی روک لیا، اب بارش کے قطرے دونوں کے بالوں میں لک چھپ جا رہے تھے۔

”پھر کرنا۔“

”کیا۔؟“

”یہ جو ابھی کیا تھا۔“

”کیا کیا تھا؟“

”وہی جو چوہے کے نام پر کیا تھا۔“

”آرخ۔ آرخ۔“ امرجہ کو پھر سے چوہے کا خیال آیا۔

”ایک بار پھر کرنا۔ یہی۔ یہی۔ پلیر۔“

”تم پانگل ہو گیا کہہ رہے ہو۔“

”جب تم یہ آرخ کرتی ہو تو تمہاری بھنویں اور آنکھیں بچکانہ سا رقص کرتی ہیں۔ اور تمہاری ناک۔ یہ دائیں بائیں لہرا کر اسانی ہے کہ اسے پکڑ کر اس پر چٹکی بھری جائے۔“

”تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ امرجہ کو لگا وہ اس کی ناک کی چٹکی بھرے گا۔

”اچھا تمہارا وقت بھی اب قیمتی ہو گیا ہے؟ اچھا چلو پھر فلم کے لیے پکا۔“

”اگر وہ راجا جانے کے لیے تیار ہو گئی؟“

”دیرا؟“

”ہاں۔ دادا نے کہا ہے، ہر جگہ اسے ساتھ لے کر جاؤں۔“

”دادا جی کو یہاں ساتھ لے آئیں وہ پھر بھی اچھا تھا۔“

”تم میرے دادا کا مذاق اڑا رہے ہو؟“

”چلو دیرا کو بھی لے آنا۔“

☆ ☆ ☆

اور وہ دیرا کو بھی لے گئی۔ دیرا تو جاتے ہی سو گئی۔ کیونکہ اسے خالص ایکشن فلمیں پسند تھیں جن میں ہر دو منٹ بعد ایک بم بلاسٹ ہو اور کم سے کم دو آدمی مرجائیں۔ اور ہیرو بس بڑی بڑی عمارتیں پھلانگتا رہے۔ اور کسی زمین پر کھڑا ہو ہی جائے تو چار اطراف فائر کھول دے۔

جب چوہے نے پہلی بار کھانا پکانا شروع کیا تو اس

نے منہ ہی منہ میں کتنی ہی بار۔ آرخ۔ آرخ۔ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ دلچسپی سے فلم دیکھنے لگی۔ اور اختتام پر اس نے تالیاں بجائیں۔ اس نے اس قسم کی فلم پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہیرو ہیروئن کے بے جھیلوں سے ہٹ کر ایسی شان دار فلم۔ مکمل ہو گیا۔

جب وہ دیرا کی سائیکل پر بیٹھ رہی تھی گھر جانے کے لیے تو عالیان نے بہت آہستگی سے اس سے فرمائش کی۔

”ایک بار کہہ دو۔ آرخ۔ آرخ۔“ اور وہ قہقہہ لگا کر دیرا کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

وہ وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ لوگوں کا آنا جھنی خوشی دیتا ہے۔ ان لوگوں کا جانا اتنی ہی تکلیف دیتا ہے۔ وہ اس وقت کبھی منی سی اسی تکلیف سے گزر رہا تھا۔

وہ عالیان مارگریٹ جو جب سیٹی بجاتا۔ دونوں ٹانگوں کو ہوا میں اچھال کر ان کی تالی بجاتا جاتا ہے تو کم سے کم پچاس لوگ اسے مڑ کر دیکھنا ضرور پسند کرتے ہیں۔ اگر وہ غصے سے بھی کسی کو دیکھتا ہے تو بھی اس پر پیاری آتا ہے۔

☆ ☆ ☆

لیڈی مرشادی کے دس سال تک بے اولاد رہیں۔ پھر جب دونوں نے بچہ گود لینے کا سوچا تو ان کے شوہر احمد حسین کا کار گئے حادثے میں انتقال ہو گیا۔ احمد حسین دل کے سرجن ڈاکٹر تھے۔ وہ ایک کامیاب انسان تھے اور ایسے کامیاب نرم خوان انسان کے چلے جانے کے بعد ان کی بیوی اتنی کامیابی سے زندگی نہ گزار سکیں۔ پہلے فالج سے ان کا آدھا حصہ مفلوج ہوا۔ وہ دو سال پر ایسویٹ ہسپتال میں رہیں۔ میکے کے نام پر ان کے خاندان میں صرف ایک باپ تھے جو ان کی دو سالہ بیماری کے دوران چل بسے۔ احمد حسین کے تین بھائی تھے۔ لیکن وہ اس صورت مر سے ملنا چاہتے تھے۔ اگر وہ احمد حسین کی جائیداد ان کے نام

کر دیتیں۔ ایک گھر اور میڈیسن کمپنی کے شیراز۔
میرچہ گود لیتا چاہتی تھیں۔ اب وہ بھی نہیں لے
سکتی تھیں۔ ان کی حالت ہی ایسی نہیں تھی۔ وہ اپنے
آپ کو نہیں سنبھال سکتی تھیں۔ بچے کو کیسے... اور
اس حالت میں انہیں کوئی بھی ادارہ بچہ نہ دیتا۔ تو
انہوں نے بچوں کو ان اداروں میں رکھ کر ہی پالنا شروع
کر دیا۔ ایک ادارہ تھا اور کڈز (ہمارے بچے) جو بچہ
پالنے کے خواہش مند افراد کو ایک بچے سے ملوا دیتے
اور پھر اس کے اخراجات کے پیسے لینے رہتے اور اسے
اپنے پاس رکھ کر ہی اس کی تعلیم و تربیت کرتے۔
مرنے یہاں ایک نہیں پورے دس بچوں کو لے کر
بالا۔ وہ کمپنی سے ملنے والے منافع میں سے اپنے
اخراجات کے لیے رقم نکال کر باقی سب اس ادارے کو
دے دیتیں۔ بچے مہینے میں ایک بار ان سے آکر مل
جاتے۔ ایک پورا دن ان کے پاس گزار کر جاتے۔ مہر کو
ماما کہتے۔

یہ مختلف قوم و نسل سے تعلق رکھنے والے بچے
تھے اور سب مہر کو بہت پیارے تھے۔ کرسس۔ نیا
سال وہ مہر کے ساتھ گزارتے۔ ان میں سے ایک
مسلمان تھا۔ وہ اپنی عید مہر کے گھر آکر کرتا۔ جیسے جیسے
بچے بڑے ہوتے گئے وہ مہر کے پاس رات بھی رکنے
لگے۔ وہ سب نہ صرف اپنے کام خود کرتے تھے بلکہ مہر
کے بھی کئی کام کر دیتے۔ مہر مہینے کے اس ایک دن اور
رات کا انتظار کرتیں جب وہ سب ان کے پاس
ہوتے۔

یہی بچے بالغ ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے
ہوتے۔ مختلف شہروں، ملکوں اور یونیورسٹیوں کی
طرف بڑھتے گئے۔ کچھ شادی کر چکے تھے۔ کچھ نوکری
کرتے تھے۔ کچھ ابھی بھی بڑھ رہے تھے۔ یہ سب
دنیا کے کسی بھی کونے میں، کسی بھی حالت میں ہوتے
مہر کو فون کرنا نہیں بھولتے تھے۔ لیڈی مہر ہمہ وقت ان
کے فون سنتیں یا انہیں سالگرہ کے تحائف بھیج رہی
ہوتیں۔ ان کی طرف سے بھیجے جانے والے فون
میسجز یا کارڈز پڑھتی رہتیں۔ مہینے دو مہینے میں کوئی نہ

کر رہی تھیں۔
بس ابویں۔ خواجواہ کا مشرقی مغل۔
”ہاں تھوڑا ڈر تو ہے۔“ مورگن نے ماما کی تائید

کی۔
”ٹھیک ہے ہاں کہہ دو پھر اسے۔ کب کروگی
شادی۔؟ میں چاہتی ہوں تم ہمارے دلہن بنو۔ لیکن
کرسس کی چھٹیوں کے علاوہ تم کہاں فارغ ہوگی شادی
کے لیے۔“
”نہیں۔ آپ کہہ رہی ہیں تو میں ہمارے ہی میں
کروں گی۔“

”نہیں۔ کرسس ٹھیک ہے۔ ہم کرسٹینا کو ہمار
کی دلہن بنادیں گے۔ آج کل میں بس وہ بھی آنے ہی
والی ہے۔ ایسے ہی کسی نمونے کو لے کر۔“
امرحہ اور سادھنا نے بلند بانگ قہقہے چھوڑے
نمونے کے نام پر۔ لیڈی مہر نے جوش کو رسٹ وایج
دی تو بے چارہ ہم غم سا ہو گیا۔ لیڈی مہر نے مورگن پر
ایک خائف سی نظر ڈالی۔

”پھر سوچ لو مورگن۔ مجھے تو لگتا ہے ایک دوبار
رونے سے ہی یہ کچھل کر ختم ہو جائے گا۔“
اس بار دونوں اتنا ہنس کر انہیں نشست گاہ سے
باہر جانا پڑا۔

جس دن سادھنا کو معلوم ہوا کہ اس کے اکلوتے
بیٹے کو ایسی خطرناک بیماری ہو گئی ہے تو دونوں میاں
بیوی کئی دن اور راتوں تک روتے رہے۔ اس کا شوہر
ایک کمپنی میں چند ہزار پر ملازم تھا۔ وہ اپنی بڑی بیماری کا
علاج کیسے کروا سکتے تھے۔ حیدر آباد میں ایک چھوٹا سا
گھرانہ کا اپنا تھا۔ لیکن اسے بچ کر بھی ان کے بیٹے کا
علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ گھر
کو بچ کر سادھنا کا شوہر یورپ کی طرف نکل جائے اور
وہاں کام کرے، انہوں نے گھر بچ دیا، لیکن اس کے
شوہر کو ویزا نہ ملا۔ ویزا ایجنٹ نے ہی بتایا کہ آدمی کی
نسبت عورت کو ویزا ملنے کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں تو
سادھنا نے ویزے کے لیے اپلائی کیا اور اسے ویزا مل
گیا۔ وہ یہاں ایشیائی گھرانوں میں کام کرتی تھی۔

پاکستانی، ہندوستانی، سعودی گھرانوں میں جا کر وہ گھریلو
کام کرتی۔ گھریلو کام کے لیے ہر گھر ہفتے میں دو دن
اسے ملتا اور بی گھنٹہ کے حساب سے پیسے ملتے۔ لیڈی
مہر کے گھر وہ پہلے کرائے دار تھی۔ پھر لیڈی مہر نے اس
کے حوالے سارا گھر کر دیا۔ وہ لیڈی مہر کو بھی دیکھتی اور
گھر کو بھی۔ دو سالوں میں اس نے کافی کمایا تھا۔
سنگاپور کے ہسپتال میں آریان کے دو آپریشن ہو چکے
تھے۔ ایک آخری آپریشن ہونا تھا۔ پھر تین تین ماہ کے
میڈیکل چیک اپ۔ ڈاکٹر بہت پر امید تھے۔ آریان
کی صحت یابی کے لیے اور ڈاکٹرز سے زیادہ سادھنا خود

تھی۔
جن گھروں میں وہ جاتی تھی وہ سب آریان کے
لیے الگ سے پیسے دیتے تھے۔ لیڈی مہر بھی ہر آپریشن
کے لیے ایک بڑی رقم دیتی تھیں۔
”آپ بہت بہادر ہیں۔“ امرحہ کو جس دن ساری
کہانی معلوم ہوئی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
”ہاں۔ میں بہادر ہوں، اسی لیے اللہ نے میرا
انتخاب کیا کہ میں اس مشکل کو آسان کروں۔ مجھے
اپنے منتخب کیے جانے پر خوشی ہے۔“
”آپ کا بیٹا بہت بڑا انسان بنے گا۔“

”میں اسے بڑا ڈاکٹر بناؤں گی اور اچھا ہی ہوا کہ وہ
اس تکلیف سے گزر رہا ہے۔ اس طرح اسے یاد رہے
گا کہ تکلیف سے گزرنے والوں کی اس نے کیسے مدد
کرتی ہے اور ان سے غفلت نہیں برتنی۔ قدرت
کے ہر اقدام میں ایک گہرا راز ہوتا ہے۔ میں کچھ سمجھ
رہی ہوں اس راز کو۔ کچھ سمجھ جاؤں گی۔“
”گلا آپریشن کب ہے آریان کا؟“

”کچھ ماہ بعد۔ اس سے زیادہ وقت میں بھی ہو سکتا
ہے۔“ سادھنا نے اطمینان سے کہا۔

امرحہ بہت متاثر تھی سادھنا سے۔ جب وہ پاکستان
میں تھی تو خود کو دنیا کی دیکھی اور مظلوم ترین لڑکی سمجھتی
تھی۔ وہ رات کو پائین اہل کی پلیٹ بھر کر کھاتی جاتی اور
روٹی جاتی۔ اسے لگتا دنیا میں اس سے زیادہ مشکل اور
مصیبت میں کوئی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ ٹھن میں

کوئی نہیں رہ رہا۔ سب سے زیادہ تکلیفیں اسے ہی ملی ہیں۔ مل رہی ہیں۔ اگر انسان دنیا میں چل پھر کر دیکھے تو اسے خبر ہو کہ جس دکھ پر وہ ایسے واویلا مچاتا ہے، دہائی دیتا ہے، وہ تو کوئی دکھ ہے ہی نہیں۔ لوگ تو کپڑے پڑے زخموں کے ساتھ بھی گنلتے ہیں۔ مسکراتے ہیں اور اصل میں وہی انسان بھی ہیں۔ جو سر کو آسمان کی طرف شکوے کے لیے نہیں شکر کے لیے اٹھاتے ہیں۔

ایک گالک شو اسٹور میں پچھلے ایک گھنٹے سے گھوم پھر رہا تھا۔ لیکن کوئی جو اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔ ہر بار وہ کاؤنٹر کا چکر لگا کر ذرا آگے نکل جاتا اور پھر سے گھوم کر کاؤنٹر کے پاس آ جاتا۔ امرجہ گو بہت مصروف تھی۔ لیکن اسے دیکھ بھی رہی تھی۔

”میں تمہیں یہ بتاؤں کہ یہاں اس اسٹور میں جو توں کی ٹویٹ نہیں ملتی۔“ امرجہ اس کے پاس آئی۔

”اچھا۔ تم نے انہیں سکھایا نہیں ٹویٹ لینا اور دینا۔“

”تمہیں کیا چاہیے۔ تمہیں کوئی جو تا پسند نہیں آ رہا؟“

”جو اچھا ہے وہ منگا ہے، جو منگا نہیں۔ وہ اچھا نہیں۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ تم یہاں کسی خریداری کے موڈ میں آئے ہو۔“

”ہاں۔ کچھ کچھ ایسا ہی ہے۔“

”اچھا دیکھو ہمارے اسٹور روم میں کچھ نقص والے جوتے رکھے ہیں۔ ہم ورنہ چاہیں تو انہیں لے سکتے ہیں۔ میں ان سے بات کرتی ہوں، تم میرے ساتھ آکر اچھے والے لیکن سستے والے جوتے لے سکتے ہو۔“

”کتنی اچھی ہو تم۔ لیکن آج نہیں۔ شاید کل۔“

”پھر تم آج کیا کرنے آئے تھے یہاں۔“

”آج۔ پتا نہیں۔ میں پتا کر کے کل بتاؤں گا۔“

گھڑی کو دیکھتا وہ چلا گیا۔ جیسے مقصد پورا ہو گیا۔

شیشے کے پار سے امرجہ نے اسے جاتے دیکھا۔ وہ ”ہاؤ ڈیپ ان لو“ کی دھن سٹی پر بجا رہا تھا اور ایسے چل رہا تھا جیسے راک اشار اپنا کامیاب شو کر کے گھر لوٹ رہا ہو۔

کل وہ پھر آ گیا۔ لیکن جوتے لے کر پھر بھی نہیں گیا۔ جب وہ اسے اسٹور روم میں لے گئی اور اس نے اس کا وہاں کافی وقت لے لیا تو عین وقت پر اسے یاد آیا کہ اس کے پاس تو کافی اچھی حالت میں دو ٹین اچھے جوڑے جوتوں کے ہیں پھر وہ نئے کیوں لے۔

”پھر تم یہاں آئے کیوں؟“ وہ زنج ہو گئی۔

”پتا نہیں۔ بس کبھی کبھی میری یادداشت ایسے ہی چلی جاتی ہے۔ جب یادداشت گئی تو میں آ گیا۔ اب واپس آ گئی ہے تو مجھے جانا ہو گا۔“

”پاکستان میں ہم تم جیسے لوگوں کو باؤلا کہتے ہیں۔“

”باؤل۔ آ۔۔۔“

”ہاں باؤل۔ آ۔۔۔ چلو جاؤ اب۔ کتنا وقت ضائع کیا میرا۔“

جاتے جاتے وہ پھر رک سا گیا۔ ”میرا خیال ہے اگر میں ایک جوڑا جوتا لے ہی لوں گا تو قوی آسبلی میں اسے یقیناً زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔“ وہ پھر سے جوتے پن پن پر گھس رہا تھا۔

”ویسے مجھے یہ خیال بھی آ رہا ہے کہ ایک اسٹوڈنٹ کو اتنا شاہ خرچ نہیں ہونا چاہیے۔ وہاں یاد آیا۔ میں نے سنا ہے کہ ایشیا میں لوگوں کے پاس اتنے کپڑے اور جوتے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کپڑے جوتے دنیا بھر کے انسانوں میں تقسیم کرنے لگیں تو ہر ایک کو دو دو جوتے اور کپڑے مل جائیں۔ کیا تمہارے پاس بھی اتنے ہی ہیں؟“

وہ گڑبڑا گئی۔ ”پتا نہیں۔“

”یعنی اتنے ہی ہیں۔ ہر وقت تم لوگ کپڑوں اور ایسی چیزوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہو اور پھر اصل باتوں پر سوچنے کے لیے دماغ میں اور جگہ ہی

نہیں رہتی۔“

”میرے دماغ میں بھی اور جگہ نہیں رہی، تمہاری اوٹ پانگ باتیں سن سن کر۔“

کندھے اچکا کر وہ چلا گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور سڑک کو بار کرتے فٹ پاتھ پر چلے اس نے کم سے کم بارش کی طرف گھٹنے کے اس پار کاؤنٹر پر سر جھکائے کمپیوٹر میں ملز کی انٹری کرتے امرجہ کو دیکھا۔

اس بار اس نے سٹی کی دھن بدل ڈالی۔ وہ ایک مشرقی دھن بجا رہا تھا۔

ڈیرک آرٹ کا اسٹوڈنٹ تھا اور اس نے ایک مقامی چینل کے لیے دو منٹ کی ڈاکومنٹری بنائی اور ڈنگ کے لیے امرجہ کو بلایا۔ امرجہ جانتی تھی وہ اب تک شرمندہ ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ اس کی مدد کرتا ہے۔ دو منٹ کی ڈنگ کے اسے اچھے خاصے پیسے مل گئے تھے اور کافی سے زیادہ معلومات بھی صرف ایک کیمرے کے ساتھ ڈیرک نے وہ ڈاکومنٹری بنائی تھی اور اچھے خاصے پیسے بنائے تھے۔ ڈیرک نے اسے اپنی پہلے سے بنائی گئی دو سری ڈاکومنٹریز بھی دکھائیں۔ اسے وہ سب اچھی لگیں، خاص کر ڈیرک کی کوشش اچھی لگی۔

چند دن سوچنے کے بعد اس نے ڈیرک سے مشورہ کیا۔ وہ مائیکسٹریونیورسٹی میں ایڈمیشن سے متعلق ایک تفصیلی ڈاکومنٹری بنوانا چاہتی تھی۔ تاکہ پاکستانی اسٹوڈنٹس کو اچھی طرح سے اپ ڈیٹ رکھا جائے۔ ڈیرک نے اسے بتایا کہ ڈاکومنٹری کے لیے بھی اسکرپٹ لکھا جاتا ہے۔ پہلے وہ اسکرپٹ لکھے۔ اس نے اپنے لکھے اسکرپٹ اسے دے دیے۔ تاکہ وہ ان سے سیکھ لے۔ انہیں کئی دن پڑھنے کے بعد اس نے پانچ منٹ کا اسکرپٹ لکھ لیا۔ ڈیرک نے کچھ بنیادی تبدیلیاں کیں اور انہوں نے ایڈمیشن سے متعلق ایک جامع ویڈیو بنائی۔ ڈیرک نے اس کی انگلش میں ڈنگ کی اور امرجہ نے اردو میں۔ ویڈیو اس نے پاکستان کے

چند ٹی وی چینلز کو بھیج دی اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑا وقت لگا اور جواب آ گیا۔ وہ ویڈیو خریدنے کے لیے تیار تھے۔ پر وہ بہت ہی کم پیسے دے رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اسے کم پیسوں پر ہی دے دینی چاہی، لیکن ڈیرک نے روک دیا۔

”کبھی فیصلوں میں اتنی جلدی نہیں کرتے۔ جلد بازی ایک بڑے نقصان کا باعث ہے شک نہ بنے۔ لیکن بڑے فائدے سے ضرور محروم کر دیتی ہے۔“

میری پہلی ڈاکومنٹری ایک سال میرے پاس پڑی رہی تھی۔ کوئی اسے خریدنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

ٹرانس کے لیے میں نے پھر اسے ایک جرنلسٹ کو دے دیا۔ اس نے اپنے بلاگ پر پوسٹ کر دی۔ بس پھر مت پوچھو۔ جن چینلز نے انکار کیا تھا۔ وہ اس کے رائٹس لینے کے لیے تڑپنے لگے یہاں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک جنہیں اچھی چیز چاہیے۔

دوسرے جنہیں اچھی بننے والی چیز چاہیے جو انہیں فائدہ دے۔ تمہیں ایک سے انکار ہوا ہے۔ تم دوسرے کے پاس جاؤ۔“

ڈیرک نے ہی اس کے ساتھ مل کر تھوڑی بہت ریسرچ کی اور اس بار انہوں نے ان پاکستانی کمپنیز کو ویڈیو بھیجی جو اسٹوڈنٹس ویرا کا کام کرتے تھے۔ انہیں ایک دوسرے درجے کی ویرا کمپنی نے ہاں کہہ دی اور

نسبتاً ”اچھی رقم آفر کی۔ امرجہ نے ہاں کہہ دی۔ یہ ہاں اچھی رہی۔ کیونکہ اسی کمپنی نے چند اور ایک ایک۔ دو دو منٹ کی ویڈیوز کے لیے امرجہ سے بات کی۔ انہیں مائیکسٹریونیورسٹی کے چند دوسرے

ڈیپارٹمنٹس کی تفصیلات چاہیے تھیں۔ جو وہ اپنے اسٹوڈنٹس کو دکھا سکتے۔ امرجہ اور ڈیرک نے وہ بھی بنا کر بھیج دیں۔ امرجہ کو اچھا خاصا فائدہ ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر یہی رفتار رہی تو وہ بہت جلد اپنا تھری

پرسنٹ کا قرض واپس لے گا۔ ہاتھ میں تھما دے گی۔

اس کی کفایت کا گراف اونچا ہوتا جا رہا تھا اور فضول

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جزی بوتلیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ معمولی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے بھی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلیوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلیوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجوانے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

اس نے اب تک کی اپنی جمع کی گئی۔ تنخواہ اور ہانکونٹریز سے ملنے والے پیسے بابا کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیے۔ وہ پاکستانی چند لاکھ تھے۔ فی الحال اتنے بھی کافی تھے۔ پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے لیڈی مہر کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

انہوں نے خاموشی سے ایک چپک کٹ دیا۔ وہ حیران چپک دیکھتی رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ لیڈی مہر اسے مشورہ دیں گی کہ ایسے کر لویا ویسے کر لو۔ لیکن انہوں نے مناسب رقم کا ایک چپک اسے لکھ دیا۔

”یہ قرض ہے“ انہوں نے اسے یاد دلایا۔

”جی بالکل ہے“ اس نے سر ہلایا۔

”تمہیں معلوم ہے امجد! کہ میں تمہیں اور تم جیسی کئی لڑکیوں کو یہاں مفت بھی رکھ سکتی ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کرتی۔ اگر ایسا کیا میں نے تو تمہیں بے کار اور ناکارہ بنادوں گی۔ میرا ایک بیٹا اسی شہر میں رہتا ہے اور وہ میرے ساتھ نہیں رہتا۔ میں نے اسے کوشش اور مسلسل کوشش کرتے رہنا سکھایا ہے۔ میرے اس آرام و گھر کے شاہانہ بستروں پر اسے نیند نہیں آتی۔ میں اپنے بچوں کو اس دنیا کے کامیاب ترین انسان بنے دیکھنا چاہتی ہوں اور ایسا انسان بننے کے لیے انہیں ایک شاہانہ نہیں محنت کی زندگی گزارنی پڑے گی۔ انہیں زبرد ہونا پڑے گا، تاکہ وہ زیرو کے آگے اٹھاد لکھ کر اپنے نمبر بڑھا سکیں۔ میرے بابا ایک کسان تھے۔ اسکاٹ لینڈ میں ان کا اپنا فارم ہاؤس تھا۔ وہ کہا کرتے تھے ”مخلوں میں زندگی گزارنے والے بد قسمت ترین لوگ ہیں، کیونکہ وہ ناکارہ ہیں“ وہ اپنے مٹی سے اٹے ہاتھ اٹھا کر اعلان کرتے ”خوش قسمت تو ہم ہیں۔ کیونکہ ہم کار آمد ہیں۔ زندگی ہم میں سانس لیتی ہے۔ زندگی ہم میں دھڑکتی ہے۔“ میں یہ رقم تمہیں ویسے بھی دے سکتی ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت دیا ہے۔ لیکن یہ قرض اس لیے ہے تاکہ اسے واپس کرنے کے لیے تم خود کو کار آمد بنادو۔ ٹھیک ہے؟“

”جی۔ ٹھیک ہے۔“

وہ سادھنا کی طرف دنگ سی دیکھتی رہ گئی اور امجد کی طرف لپکی۔ فون کیا اور وادی، اہل سب کو جی جان لگا کر تسلی دی۔

”گھبراہٹیں نہیں، وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس کا انداز مضبوط تھا۔

”اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔“ اہل روٹی جاتی تھیں۔

”میرے پاس آپ کی مایوسیوں کے جوابات نہیں ہیں۔“ دادا اس کی مختلف ڈاکٹرز سے بات کرواتے رہے۔ ٹھیک تین گھنٹے بعد انہیں ہوش آگیا اور وہ دن بعد وہ گھر چلے گئے۔

دکان میں موجود میں پچیس لاکھ کے قالمین جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ بابا کے سینے میں تکلیف کیوں نہ اٹھتی۔ کاروبار کے نام پر وہ کنگال ہو چکے تھے۔

پاکستان میں سب بے حد پریشان تھے کہ اب کیا ہو گا اور مانچسٹر میں وہ تنہی سے ان معاملات کا حل نکالنے میں مصروف تھی۔ وہ فکر مند ضرور تھی۔ لیکن ہنگان یا پریشان نہیں۔

”واجد سود پر قرض لے رہا ہے۔“ دادا نے فون پر بتایا۔

”سود پر؟“ اسے دھچکا لگا۔

”ہاں۔۔۔ میری کوئی بات نہیں سن رہا۔ بنا سود کے قرض کیس سے نہیں مل رہا۔“

”سود حرام ہے دادا۔“ اسے دکھ ہوا جان کر۔

”یاد ہے مجھے اورواجد کو بھی یاد دلایا ہے۔ کہتا ہے سود نہیں ہے۔ بس وہ قرض پر منافع لیں گے۔“ دادا

آبدیدہ ہو گئے یا وہ گھر بیچے گا یا قرض لے گا۔ ورنہ دکان کیسے چلائے گا۔

”بابا سے کہیے گا قرض نہ لیں، میں کچھ کرتی ہوں۔“

”تم کیا کرو گی؟“ دادا حیران ہوئے۔

”کیوں۔ بہت کچھ کر سکتی ہوں میں۔ جہاں ایک مشکل آتی ہے وہاں دائیں بائیں سو حل آتے ہیں۔ میں دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھتی ہوں، حل ضرور نہیں آس پاس ہی ہے۔“

خرچی کا نہ ہونے کے برابر۔ سڑیاں آپکی تھیں، تو اس نے اپنے لیے صرف گرم کوٹ لیے تھے۔ جو وہ پاکستان سے لائی تھی۔ وہ یہاں بے کار تھے۔ یہاں کی سردی اس کی سوچ سے بڑھ کر تھی۔

رات گئے ایک دن دادا کا فون آیا۔ اسے وہ کافی پریشان لگے۔

”پریشان نہ ہونا امجد۔ دھیان سے سنو تمہارے بابا ہسپتال میں۔ میں۔۔۔ پوری اعظم مارکیٹ میں آگ لگی تھی۔ بسواجد خود کو سنبھال نہ سکا۔“

”کیا ہوا دادا؟“ وہ چلا اٹھی۔

”وہ ٹھیک ہے۔ سینے میں درد ہوا تھا اس کے۔“

”میری بات کرو امجد۔“

”ابھی وہ ہوش میں نہیں ہے، تم دعا کرو۔“

وہ کمرے سے نکل کر باہر کا دروازہ کھول کر آسمان تلے آگئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ایسے جیسے دنیا کی ہر چیز اسے دباؤ سے مار ڈالے گی۔ سادھنا اس کے پیچھے آئی۔

”پاکستان میں سب ٹھیک ہے امجد۔“

”میرے بابا ہسپتال میں ہیں۔“ اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ ”وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

وہ منہ اٹھا کر سادھنا کو دیکھنے لگی۔

”تم اتنا گھبراہٹ کیوں رہی ہو۔ وہ دن پہلے تم مجھے کہہ رہی تھیں۔ تم سیر جوان ہو۔“

”میرے اندر گھبراہٹ بڑھ رہی ہے۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔“

”یہ گھبراہٹ نہیں مایوسی ہے۔ جب انسان مایوس ہوتا ہے اس کے اندر ایسے ہی اہل اٹھتے ہیں۔“

اسے بے چین کر دیتے ہیں۔ یہ مایوسی ہی ہے۔ ورنہ تم ایسے نکل کر باہر کو نہ بھاگتیں۔ اپنی عبادت کرتیں۔

پہلا کام رونے کا نہ کرتیں دعا کا کرتیں۔ خود کو سنبھالو۔ اپنے گھروالوں کا حال احوال لو۔“

یہ بات ”مجھے بتاؤ“ میں اور کیا کہیا کروں گے

240 2014

کڑی۔ رات بارہ بجے سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ وہ

241 2014 8

241 جولائی 2014

ماہنامہ شعاع جولائی 2014 240

سمیرا حمید



امرد کی پیدائش کے وقت اخلاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منخوس" تشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا لکھنؤ والی اور مہنوں بہن بھائی واپس مہار اور علی اسے اکثر جہنم جلی منخوس کا لفظ اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی خواست کے منجھٹام قصبے میں کراچہ خود ترسی کا شکار ہو کر روٹی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرد کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرد کی اپنے دادا سے خوب نفرت ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لاہوری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لاہوری ہیں تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم بڑھائی پر دھیان دو اور اسکا کرشب لے کر یا ہر ملک چلی جاؤ۔ امرد اپنے باپ، بہن بھائیوں کی طرح بڑھائی میں کمزور ہے مگر دادا کی بات پر وہ غائب کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کیا کرتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے مگر چند روز قبل دلہا کی جو ان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی خواست پر منہ بند لگ جاتا ہے۔ امرد دل برداشتہ ہو کر غیظ کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرد کی زندگی مزید سخت ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف چھوٹے بچوں کا لڑکھنڈو سٹیوں کے ہزاروں فن نہن اسکا کرشب فارم بھرتی ہے مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر ماہیٹرو نیورسٹی سے اسے اسکا کرشب مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلباء سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے جس کی رو سے امرد کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائیگی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ لاٹری کی میزبانی کے

مکمل ناول



بعد امرد کو اپنی رہائش اور اخراجات کا نو بندوبست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد رات میں بتائیں۔ دوا
تی امرد کے لیے پیسے اکٹھے کر کے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ خدرا شمس بیٹی اور
اور لیلی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرد پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی ممبر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست
بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی ممبر نے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے۔ شمل کاک نامی اپنے ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد
کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک مالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سارا حنا دیر اور این ادن سے اس کی دوستی ہو جاتی
ہے۔ جاب کے دوران دو ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکو مٹھی علم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرد کے بابا جن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس
بچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں انیک اور جاتا ہے۔ امرد انہیں سلی دیتی ہے اور ڈاکو مٹھی علم سے ملنے والے
پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ترانسفر کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی ممبر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرد وہ رقم بھی
پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرد کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرد اپنی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب مالیان
مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرد کی چیخ اٹھ جاتی ہے۔

دوسری قسط

"تم یہاں۔۔۔؟" امرد وہ قدم پیچھے ہٹتی۔
"تم یہاں۔۔۔؟" کھڑکی کی چوڑھٹ پکڑے وہ
کرنے کے قریب ہوا پھر اس نے جلدی سے منبوطی
سے کھڑکی کو تھام لیا۔
جنگل، بیابانوں میں انہ میرے کے بستر پر بیٹھی نیند
سوئے سب ہی جگنو اس کی آنکھوں میں ایک ایک کر
کے جا گئے تھے۔
"یہ میرا کرا ہے۔"
"یہ میرا کرا ہے امرد!" مسکراہٹ بنا وہ نیچے کود گیا۔
کسی جنگل انگور کی طرح جسے وہ اپنا گرو ماننا ہو گا۔
امرد نے بے طرح حیران ہو کر جیسے خود کو ہوش میں
لا لیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی ابھی جو اس
نے دیکھا وہ سچ تھا۔ حقیقت تھا خواب نہیں تھا۔ اس
کا ہونی فیلاویسے اس کے کمرے کی کھڑکی میں آ کر اسے
یہ بتا گیا تھا کہ یہ اس کا گھر ہے۔ اس نے جلدی سے
آگے بڑھ کر کھڑکی سے سر باہر نکالا۔ وہ ذرا دور دوسری
کھڑکی کی طرف لپک رہا تھا اور پار پار گھڑی دیکھ رہا تھا۔
آخر وہ کیا کر رہا تھا اسے آدمی رات کے وقت

اس کی رہائش گاہ کے گرد پاگلوں کی طرح کود پھندا رہا
تھا۔ امرد نے سر کو ذرا اور آگے کر کے کہا۔
"تم کیا کر رہے ہو۔۔۔ جلدی یہاں سے۔"
اس کی آواز پر وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔ جیسے برہوں
کے دیس کی کمالی سنتے ہی سراسخا کر آسمان کی طرف
دیکھنے لگتے ہیں کہ کیا کوئی پری ان کے سروں کے اوپر
اڑتی جلدی چھڑی تھما رہی ہے۔ اگر نہیں تو یہاں
نہیں! اگر ہاں تو وہ نظر کیوں نہیں آتی۔ اچھا۔۔۔ وہ
نظر آگئی۔
وہ نیچے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے سر
نکالے اس پر تھا، ہوری تھی۔
"پاگل ہو گیا؟" آواز کو دھیمادکھ کر وہ چلائی۔
"پاگل ہوں میں۔" لیکن پاؤں نہ لٹا اسے ابھڑا کچا کر
مسکراہٹ بنا کر اس نے سر ہلایا۔
"اچھا تو یہ تمہارا گھر ہے۔" اپنی دانست میں وہ اسے
چڑا رہی تھی تو پھر سیدھے راستے اندر آ کر دکھاؤ۔
"اچھا!" مالیان نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے اور اس
کے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

"یونیورسٹی کو تھر ہے اس پر اور مجھے اس پر۔ بزنس کے نئے رجحانات اور طریقوں پر اس نے جو اسٹینڈنٹ نکلی تھی اسے یونیورسٹی نے کٹانے کی صورت میں چھاپ کر لا بھری میں رکھا ہے۔"

سلاو حنا نے آگے بڑھ کر لیڈی مہر کو گلے سے لگایا اور سالگرہ دینے کی۔ امرت بھی آگے بڑھی۔ عالیان نے جلدی سے کیک چھاپ لیا۔

"یہ بچا ہوا کیک میں ساتھ لے جاؤں؟"

"اتنے سے کیک میں بھی تمہاری جان ہے۔"

لیڈی مہر دست خوش تھیں۔

"نہیں۔۔۔ کیک میں جان نہیں رہی لب۔۔۔ ملا آپ کو معلوم ہے لوگ آپ کے گھر کو یونیورسٹی میں کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں؟"

"شٹل کاک۔۔۔" کیا معصوم انسان تھا تو وہ کیسے سچ اگل رہا تھا۔

"کون کتنا ہے میرے وائٹ ہاؤس کو شٹل کاک؟"

عالیان نے امرت کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں کہتی۔ یونیورسٹی میں پہلے سے ہی یہ شٹل کاک کے نام سے مشہور تھا۔ میں نہیں کہتی۔" امرت گھبرا گئی۔ یہ میں بیٹا دونوں کیسے ہو کھلا دیتے تھے۔

"عالیان! آج رات ہمیں رہ جاؤ۔" وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھیں۔ عالیان ہنسنے لگا۔

"آپ مجھے رہنے کے لیے کہہ رہی ہیں؟"

"ٹھیک ہے جاؤ پھر۔"

وہ اپنا ہیک اٹھا کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ امرت حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ یہ کیا طریقہ ہے آنے اور جانے کا۔

"آج میں دروازے کے راستے پر چلا جاتا ہوں۔"

عالیان لیڈی مہر سے مل کر کمرے سے باہر گیا۔

"کیا ڈر لگا ہے؟" امرت پوری قہقہے سے چلائی۔

اس نے جھرجھری لے کر ڈرنے کی لوٹکاری کی اور کلن میں انگلی گھماتے لگا۔ پھر سر کو جھکا کر کلن کو صاف کرنے کا عمل کیا۔ امرت کو کافی برا لگا۔ اس نے اپنے اسٹڈی ٹیبل پر رکھا ایک عدد موٹا میگزین اٹھا لیا اور اسے دے مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا عالیان کو برا لگا۔

وہ سنجیدگی سے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا وہ کھڑکی میں کھڑی جولیٹ ہے اور کیا وہ نیچے کھڑا رہیو ہے؟" ستاروں، بھری رات نے وقت کے کلن میں سرگوشی کر کے پوچھا۔ وقت نے کندھے لپکائے اور مسکرا کر کہا "انتظار کرو۔"

امرت میگزین اسے دے مارتی تو تیزی سے گھر کی دوسری طرف چلا گیا۔ اس نے تقریباً خود کو آدھا کھڑکی سے باہر نکال کر اسے ڈھونڈنا چاہا لیکن وہ اسے نظر نہیں آیا۔

کچھ ہی دیر میں اسے گھر کے اندر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ رات کے اس وقت اس طرح کی آوازیں کتنا عجیب تھا۔ خاص کر لیڈی مہر کی آواز۔ کاک وہ کمرے سے باہر آئی تو سلاو حنا بھی اپنے کمرے سے نکل کر آچکی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"ویدیو کا بیٹا کیا ہے۔ انہیں سالگرہ دینے کے لیے۔"

"کب آیا۔؟"

"ابھی۔۔۔ آؤ اندر چلیں۔" سلاو حنا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں لیڈی مہر کے کمرے میں چلی گئیں۔

اور۔۔۔ اور لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا عالیان انہیں منا سا ہوم بیک کیک کھلا رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مصروف تھے جیسے دنیا میں اکیلے وہ دو انسان ہی موجود ہوں۔

امرت دیکھتی ہی رہ گئی۔

"میرا بیٹا بھی تمہاری یونیورسٹی میں ہی پڑھتا ہے۔"

لیڈی مہر نے اسے ایک بار دیکھا تھا۔

ہوئے ماس کے ہاتھ سے بنی گرل ایٹ ونڈو جیسی لگ رہی۔ بس تم ذرا غصے میں ہو۔ ماس کی گرل تو مسکراتی ہے۔ بیک کو سینہ ملتا تو توں ٹانگوں کی تلی بجاتا رہ چلا گیا۔

”بند رہو۔“ اتنے پیارے اسپائیڈر مین کو امرتہ بندر کہہ کر بندر نے لگی۔ اس کا دیا ایک دھچکن میں رکھ تھی۔ اس کا کوئی موڈ نہیں تھا رات کے اس وقت کیک کھانے کا علیکن وہ علیان کے اس طرز آنے کے بارے میں نہ چاہتے ہوئے بھی رات گئے تک سوچتی رہی۔

یہ اس کا گھر ہے۔ یعنی علیان بھی لیڈی سرکار وہ بچے سے جسے انہوں نے پالا ہے۔ علیان سے مل کر اسے کبھی یہ گمان نہیں ہوا کہ وہ بھی کسی ایسے ادارے میں رہا ہے جہاں بے شمار اور ناجائز بچے پرورش پاتے ہیں۔ اس کے انداز و اطوار ایسے تھے کہ لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے خاندان کا چشمہ چرخہ ہے۔

امرد کو عجیب سا لگا۔ کیا یہاں ہر وہ سرا شخص ایسا ہی ہے۔ ظہیر خاندان کے پرورش پالے والے۔ ناجائز۔

اس کا نام علیان تھا۔ اس کی ماں کا مارگریٹ تھا یہ سب کیا چکر تھا۔ شاید لیڈی سر نے اس کا نام علیان رکھا ہو۔ اسے اردو سکھائی ہو اور نہ شاید وہ بچہ ڈائن کیا ہر مین ہو تا لیڈی سر اپنے سب ہی بچوں سے بہت پیار کرتی تھیں اور بچے ان سے تو ایک بچہ ان کے لیے اپنا نام تو بدل ہی سکتا ہے۔ ان کے ہائی بچے بھی تھوڑی بہت اردو بول لیتے تھے۔ تو علیان کسی کی ناجائز اولاد ہے۔ اسے والدین کے نام پر صرف ملے۔ اسی لیے اس کا سر نہ ہمارا گریٹ ہے۔

علیان اس کا اچھا دوست بننا چاہتا تھا اس کے بارے میں ایسی معلومات ہونے پر وہ اس کے لیے انوس محسوس کر رہی تھی۔ صرف انوس۔ اور کچھ نہیں۔

کھلی کھڑکی سے لٹھری ہوا اندر آ رہی تھی۔ امرتہ کو اس وائٹ ہاؤس میں رہنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا

”تمہارا کمر اس طرف ہے؟“

”کیوں؟“

”مجھے اس کی کھڑکی دیکھنی ہے؟“

”کیوں؟“

”اتنے کیوں؟ مجھے دیکھنا ہے کہ لوہے سے نیچے کھڑا میں کیسا لگ رہا تھا۔“

”جیسے سامنے سے کھڑے لگ رہے ہو۔“

”کیسا لگ رہا ہوں؟“

”افسوس!“ امرتہ کو خاموش ہونا پڑا۔

اور کھلے دروازے سے اندر جھانک کر اس نے خود ہی اندازہ کر لیا کہ یہ اس کا کمر ہے۔

”تم لیڈی سر کے بیٹے ہو؟“

”بالکل!“ وہ کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر ٹھیک اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ خود کھڑا تھا۔

”لیکن ان کا نام تو مارگریٹ نہیں ہے۔“

ایک دم سے علیان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے جلدی سے اپنی پشت سے بیک اتارالور جو چٹا مٹا ایک بیچ گیا تھا وہ نکال کر امرتہ کے آگے کیل۔

”میں نے بیک کیا ہے۔“

”تم لگ ہو۔“

”اوکے! میں چلا۔“ اس نے ایک دم ایسے ہاتھ چھوڑ دیے جیسے وہ بیان نہ دیتے ہو مگر گیا ہو۔ امرتہ بیچ و باقی کھڑکی کی طرف لپکی نیچے جھانکا۔ پتہ سے بھولتا وہ زمین پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ امرتہ نے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا۔

”گڈ بائے کے لیے تھینکس۔ اب تم سو جاؤ۔“

وہ دونوں ہاتھوں کو منہ کے دائیں بائیں رکھ کر ذرا سا پالیا۔

گڈ بائے کون کہہ رہا تھا اسے ”امرد تو اس بندر کے قاتل دیکھ رہی تھی۔ غصے سے اس نے کھڑکی بند کر دی تھی۔“

”میں نہیں جانتا کہ میں وہاں سے یہاں کھڑا کیا۔“

”کے لیے لیکن یہاں سے تم کھڑکی سے بھاگتے۔“

عجبت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
 "یہ دیکھو کیا بنا ڈالا انہیں نے مجھے۔ آج کل
 جرمی میں ہوتا ہے۔ اپنا بزنس کر رہا ہے اور ایک این
 جی او بھی چلا رہا ہے۔ یہ بارہ سال کا تھا جب ایک
 رات میرے پاس رہا تو رات کے کسی پہر اپنے بستر سے
 نکل کر میرے بید کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ نچالے
 کب تک کھڑا رہا۔ جب اچانک میری آنکھ کھلی تو میں
 نے دیکھا کہ یہ میرے پاس کھڑا مجھے ٹنگی پاندھے دیکھ
 رہا ہے۔ کیا مجھ سے زیادہ کوئی عورت اس کو زمین پر
 ایسی خوش قسمت ہوگی جسے اس کی اولاد راتوں کو ایسے
 اٹھ اٹھ کر محبت سے دیکھتی ہو۔"

بہت دیر تک لیڈی مرسب کی باتیں کرتی رہیں۔
 پھر امرجہ انہیں این کے کمرے میں لے آئی۔ بید سائڈ
 ٹیبل پر ایک چھوٹی سی تصویر فریم میں رکھی تھی وہ پہلے
 وہاں موجود نہیں تھی۔

"یہ عالیان نے دی ہے۔" عید فخر تصویر کو ہاتھ میں
 لے کر اسے ہونٹوں سے لگانے لگیں۔ تصویر ہاتھ
 سے ہٹائی گئی تھی جس میں عالیان نے اپنے تخیل کو
 دکھایا تھا کہ وہ لیڈی مرسب کو نو جوان اور خوب صورت کیسے
 دیکھنا چاہتا ہے۔

"بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔" انہوں نے امرجہ
 کو پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنے سب بچوں
 کے بارے میں بتایا تھا۔ اب وہ اس کے بارے میں
 کہیں نہ سنا تھیں۔

"انھارہ سال کا ہونے کے بعد جب یہ ادارے سے
 نکلا تو میں اسے کھر لے آئی۔ یہ میرے دو سرے
 سب بچوں میں سب سے چھوٹا تھا اور بچپن میں بہت
 رویا کرتا تھا۔ جب یہ ایک طنز اور ایک رات میرے
 پاس رہ کر جاتا تو مجھے بتایا جاتا کہ وہ واپسی پر بہت مشرب
 ہو جاتا ہے۔ روتا ہے رات رات بھر سوتا نہیں کھانا
 نہیں کھاتا۔ پھر میں جا کر اسے مل کر آئی لیکن اسے
 کھرنہ بلاتا تھا۔ پھر یہ بڑا ہو گیا تو میں نے سوچا اب اسے
 اپنے پاس رکھوں گی۔ وہ کھر آگیا اور بہت خوش تھا
 بلکہ خوشی سے روتا رہا۔ کئی کئی گھنٹے کھر کی دھڑکیوں کو

رات تک جب آخری تھنڈ بھی آچکا تو ان سب
 نے آتش دان کے پاس بیٹھ کر وہ تحائف کھولے۔
 اتنے بیش قیمت تحائف تھے کہ امرجہ کی آنکھیں خیر
 ہو رہی تھیں۔ لیڈی مرسب تحفے کو کھولتیں اسے
 کتنی ہی دیر چھوٹی رہیں۔ اپنے ہونٹوں سے لگاتیں اور
 اپنی آنکھوں پر رکھ لیتیں۔ وہ تحائف بلاشبہ بہت قیمتی
 تھے کیونکہ انہیں محبت سے خریدا گیا تھا۔ بے اولاد
 ہو کر بھی ایک خاتون نے اولاد والوں سے زیادہ خوشی پائی
 تھی۔ اور یہ صرف اسی لیے ممکن ہوا تھا کہ انہوں
 نے انسانیت کی معراج کو چھو لیا تھا۔ انہوں نے رنگد
 نسل کو مٹا کر ان سب کے گلے سے لگایا تھا۔

وہ ایک ایک تحفے کو کھولتیں اور اسے بیچنے والے
 کے بارے میں انہیں بتاتی جاتیں۔

"دیکھو ذرا امور کن کو۔ اتنی مہنگی گھڑی مجھے بیچ
 دی۔ مجھے اس کی ضرورت ہے یا اسے۔ اب میں کچھ
 کہوں گی تو ناراض ہو جائے گی۔ ہر سال مجھے پہلے
 سے مونگا تھنڈ دیتی ہے۔ پارٹ ٹائم چاب کرتی ہے
 ۔۔۔ جب گھر آیا کرتی تھی تو میرے ران میں کلن کے
 ساتھ اپنا بایاں کلن جوڑ کر سوا کرتی تھی اور اگر کبھی
 سوتے میں اس کا سر کھسک جاتا تو اٹھ کر پھر سے میرے
 کان سے کلن ملا کر سو جاتی تھی۔ جانے اسے کیا خط
 تھا۔ کتنی ہی رات میں خوابوں میں جو کچھ بھی آپ
 سنتی ہیں۔ میں بھی وہ سننا چاہتی ہوں۔ اور اسے دن
 اٹھ کر مجھے بتایا کرتی تھی کہ رات مجھے گئے والے
 سارے خواب اس نے بھی سنے ہیں۔" ساتھ ساتھ
 لیڈی مرسب اپنی آنکھوں کی ٹی صاف کرتی رہیں۔

یہ باتیں سن کر جان کر تو امرجہ کو لگ رہا تھا اس نے
 ملک نہیں بدلا۔ دنیا ہی بدل لی ہے۔ کیا دنیا میں لیڈی
 مرسب جیسے اور بھی لوگ ہیں۔

"یہ ڈیفنس نے خود بتایا ہے۔" انہوں نے لکڑی کے
 نفیس تختے کو ان سب کے سامنے کیا۔ تختے پر ایک
 تصویر کھدی تھی جس میں ایک عورت کرسی پر بیٹھی
 ہے اس کے سر پر فرشتوں کا ہالہ چمک رہا ہے اور اس
 بچے اس فرشتہ صفت خاتون کے سامنے بیٹھے اسے

عملی نہیں اپنائی تھی۔ اور تو اور اگر وہ سو رہے ہوتے اور دادا انہیں اٹھانے کی کوشش کرتے کہ بہت سوئے تو لٹل لور دلولی دادا سے لڑنے لگتیں کہ کیوں اٹھایا جا رہا ہے انہیں۔ بچے ہیں۔ سونے دیا جائے۔

”یہ بچے ہیں۔ دن کے دن بچ رہے ہیں۔ کلم والوں نے اپنے دن کا تو حارنق کمالیا ہے۔ اس عمر میں میں نے اپنے گھر کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔“ دادا کہتے۔

”بوقت اور تھے۔ لٹل برابن جانتی تھی۔“
 ”وہ اچھے وقت تھے۔ میرے لباہی تھے سو جوتے لگاتے تھے اگر میری آنکھ اذان فجر کے بعد کھلتی تھی۔ مسجد کے امام صاحب نے بچوں کو جلدی اٹھانے کی عادت ڈالنے کے لیے لٹل فجر پڑنے کی ذمہ داری باری باری سب پر لگائی تھی۔ سمجھ دار لوگ تھے اس زمانے کے۔ حکمت سے تربیت کرتے تھے۔ میری ماں محمود پر روٹیاں لگاتی تو میرا باپ مجھے محمود کے پاس بٹھارتا کہتا تھے بھی پتا چلتا چاہیے کہ تیری ماں کیسے مجلس کر تیرے لیے روٹی پکا رہی ہے۔ میرے لباہی کے نملنے کی باتیں میری ماں مجھ سے بھڑائی۔ کتنی تمہارے لیے محنت مشقت کر کے آتا ہے۔ اس کی دھول مٹی صاف کرنے کی مشقت تم کرو۔ اگر ہمارے ماں باپ ہمارے چاؤ چوٹھے ہی کرتے رہتے تو وقت کی سختی نے ہمیں نہیں کر رکھ دیا ہوتا اور ہم چلنے سے پہلے گرنے جیسے ہو جاتے۔“

”بس بس۔“ دلولی کو ہمیشہ دادا کا پکچر اٹکتا۔
 دادا کے اس پکچر کی سمجھ اب احمد کو آ رہی تھی۔
 ”پھر کیا ہوا۔؟“ احمد کو بہت دلچسپی ہو رہی تھی اس قصے میں۔

”مجھے اتنا تو یقین تھا کہ وہ محفوظ ہو گا لیکن کبھی کبھی مجھے بہت ڈر لگتا۔ فون بجاتا تو میرا دل سمجھ جاتا۔ میرے کان ڈور تیل کی آواز پر گنگے رہتے لیکن پورا سل بیت گیا۔ اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک رات میں سو رہی تھی تو کسی نے میرا کلف اٹھا کر پلاٹم کے

کمرے کو دھک رہتا آتش دہن کے قریب بیٹھا اور کھتا رہتا اور پھر رات رات بھر بی بی پر ایکشن فلمیں دکھاتا رہتا۔ میں نے سوچا کیا نیا گھر کا ماحول ملا ہے شاید اس لیے لیکن کئی ہفتے گزر گئے اس کے معمولات میں تبدیلی نہ ہوئی دن بھر ہر کھیتا۔ رات کو فلم لور ویڈیو گیمز میں نے انتظار کیا کہ شاید وہ خود کو بدل لے۔ وہ بڑا ہو چکا تھا اب اسے سمجھ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ زندگی میں آگے بڑھنا چاہیے تھا لیکن وہ مجھے مایوس کر رہا تھا۔ ایک دن جب شدید برف باری ہو رہی تھی میں نے اس کے چند گرم کپڑے بیگ میں رکھے اور اسے چند پائڈز دے کر گھر کے دروازے کے باہر کیا اور اس سے کہا۔

”انسان بن جاؤ تو آجاتا۔ اپنے گھر کو میں تمہیں بہاد کرنے نہیں دلوں گی۔“

”پھر؟“ احمد کو بے تحاشا حیرت ہوئی۔ لیڈی سر اتنی سختی سے کام لیتی رہی تھیں۔

”پورا ایک سال مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ وہ بہت خدی ہے۔ غصہ بھی بہت آتا ہے اسے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسے مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ مجھے دکھ ہوا کہ شاید میں نے اس کے ساتھ زیادتی سختی سے کلم لیا۔ لیکن میں کیا کرتی۔ میرے گھر کا آرام و آسائش اسے بہاد کر رہا تھا۔ میں اپنے گھر کو آگ لگا سکتی تھی لیکن عالیان کو ایسے کام ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔“

لیڈی سر کے بیٹے کے قریب کاتوج پر بیٹھے احمد تھوڑی دیر کو چپ سی ہو گئی۔ اس کے دونوں بھائی لگا تار تیل ہوتے رہتے تھے اسکول و کالج میں لیکن کبھی انہیں ڈانٹ کے علاوہ کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ بابا ان کا جیب خرچ بند کر دیتے تو اہل چپے چپے انہیں پیسے دیتی رہتیں۔ در نہ داری۔ آئے دن وہ نئی سے نئی موٹر سائیکل بدلتے۔ رات دن ہائیک چلاتے رات گئے گھر آتے۔ لور نہیں تو کپڑا موبائل کے ساتھ مصروف رہتے لور اہل بابا کے سامنے یہ سب کرتے لیکن کبھی انہیں ٹھیک کرنے کے لیے کوئی حکمت

کو نہ جا بھرتے ساتھ چلنے کے لیے کہہ
"میں سائیکل پر نہیں جاؤں گی۔"
"کیوں۔ ابھی بھی ڈرائی ہو سائیکل پر بیٹھنے سے؟"

"جیسے تم چلاتی ہو کوئی بھی بیٹھ کے لیے ڈر سکتا
ہے۔ یونیورسٹی تک ٹھیک ہے۔ کس کو اور جانتا ہے تو
سب سے یا بس۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں بس سے Plutt Lane
آگئیں۔ موسم بدل گیا تھا تو دیر لائٹ شوڑ بننے لگی
تھی۔ چست جینز جیسے جنگل میں سیر کے شکار کے لیے
جاری ہو۔ بالوں کے نت نئے اسٹائل بنائے ہوئے
وہ اپنی آنکھوں کو ایسے چوکھارہ کر چاتی جیسے کسی غصہ
انجینی کی لیجنٹ ہو۔ امرد کو اس کے ساتھ چلنے
ہوئے ایسا احساس ہوتا جیسے وہ اس کی بلائی گارڈ ہے اور
کوئی امرد کو کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔
وہ دل ہی دل میں خواہش کرتی کہ کاش وہ بھی یویرا جیسی
ہو جائے۔

اس نے یویرا سے پوچھا نہیں۔ خود سے ہی سوچ لیا
کہ وہ خریداری کرتے جا رہی ہے کپڑوں کی، لیکن
گیلری پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ شاید وہ یہاں اپنے
کسی آرٹیکل کے لیے مواد اکٹھا کرنے آئی ہے یا اپنے
بلاگ کے لیے کچھ تصویروں لینے۔ جس ہارٹیک جی
سے وہ ملبوسات کا جائزہ لے رہی تھی وہ عام انداز نہیں
تھا۔ وہ لیجنٹ کا سا انداز۔

"تمہارا یہاں چوری کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے نا؟"
کواز کو آہستہ رکھ کر امرد نے پوچھا۔
"تم میرے بارے میں ایسے بھی سوچ سکتی ہو؟"
ایجنٹ نے اسے گھورا۔

"نہ۔ تم اسی قسم کی فائبر دیکھتی ہو نا؟"
"مطلب جو فلوئس میں دیکھتی ہوں وہی سب
کرنے بھی لگوں۔ مجھے یقین دلاؤ کہ پاکستان میں
سب تمہارے جیسے نہیں ہیں؟"

امرد نے منہ پھلایا اور ایسا انداز اپنالیا کہ اب وہ
ویرا سے کوئی بات نہیں کرے گی۔ شام تک۔

چھوٹے سے کیک پر ایک موسم جی جلا کر میرے آگے
کیا۔ وہ مایان تھا۔ وہ کھڑکی کے راستے میرے
کمرے میں مجھے سربراہ بننے آیا تھا۔
"کو تو یہ روایت اب تک قائم ہے۔"

"ہاں! لیڈی سر مسکراتے لگیں۔ لیکن اب کچھ
ایسے کہ میں اپنا کمر بدل سکتی ہوں۔ وہ ایک ایک
کھڑکی پھلانگتا جھانکتا آتا ہے۔ اس رات اس نے
ماچسز یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ کارڈ میرے آگے رکھا۔
میں انسان بن چکا ہوں۔" اس نے فخر سے مجھے
بتایا۔

"یونیورسٹی نے اسے اسکا رشب دیا تھا۔" لیڈی سر
نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی۔ "اس نے مجھے
مایوس نہیں کیا تھا۔ جب میں نے ان سب بچوں کو گود
لیا تھا اس وقت میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ میں
انہیں بہترین انسان بنائوں گی۔ مجھے کوئی بھی راستہ اپنانا
پڑے ورنہ نہیں کہوں گی۔ ایک عورت کی گود میں
جب بچہ آتا ہے تو اس پر غموں اور دلیوں۔ جتنی بڑی ذمہ
داری عائد ہوتی ہے۔ ایک ایسا قرض جس میں غفلت
کی گنجائش نہیں ہے۔ جب ایک انسان کو پرورش
کے لیے۔ تربیت کے لیے ایک سراسر انسان ہونا چاہتا
ہے تو جیسے کل انسانیت کی نگاہیں اس کے ہاتھ میں
دے دی جاتی ہیں کہ اسے انہیں بتاؤ کہ کل انسانیت
کے لیے وہاں بن جائے یا وہ بندہ بشر جو اپنے آگے اور
پیچھے اور دائیں اور بائیں خیر کی روشنی بکھیر رہا چلا جائے
۔۔۔ سارے انسان خیر ہوتے ہیں امرد۔۔۔ بس ان کی
پرورش کے جو گواہ ہوتے ہیں وہ انہیں کچھ کا کچھ
بنادیتے ہیں۔ یہ سب پھول ہوتے ہیں بس ہم ہی
انہیں توڑ کر مسل کر اپنی مرضی کے پتھر میں پھینک
دیتے ہیں۔"



ویرا کو Plutt Lane پر واقع گیلری تک
کاٹیجوم جانا تھا۔ پلٹے اس نے امرد کے لیے بالوں کی
ٹون کو کول کول مل دے کر خصوصیت دی انداز میں

جب وہ جی بھر کر گیلری دیکھ چکی تو ویرا کے پاس
 آئی۔ وہ ایک وکٹوریئن شوکیس کے سامنے گھڑی چٹل
 سے کھڑی ہو کر ہنسی ماری تھی۔
 ”اب یہ کیا کر رہی ہو؟“

”اپنے لیے ڈریس بنا رہی ہوں۔“ اپنے کلم میں
 مصروف ہو کر بولی۔

وہ ایک وکٹوریئن فراگ کا اسکیج بنا رہی تھی۔ جس
 کے بانو گھنٹی تک تھے اور آگے جلی گلی ہوئی تھی جو
 کلائی پر ہڈی لٹکی ساخت میں بند ہو جاتی تھی۔
 فراگ تین چار مختلف رنگ کے کپڑوں سے بنائی تھی۔
 لیکن اس کا پراٹم کلر ہکا جیلا تھا اور جا بجا اس پر سفید جلی
 کے پارچے لہریے دے کر چھوڑے گئے تھے۔ اس کا
 گھیرا تھا کہ امرتہ کے پانچ شلوار سوٹ آرام سے بن
 سکتے تھے۔

امرتہ نے ویرا کی پسند کی بلوری۔ بلاشبہ وہ ایک
 بے حد نفیس فراگ تھی اور اس کی خاص بات یہ تھی۔
 کہ اسے دیکھنے سے ہی ایک شان کا احساس ہوتا تھا۔
 مستہری اور اعلیٰ فن کا۔ وہ اپنا کلم مکمل کر چکی تو وہ
 دونوں باہر آگئے۔ امرتہ کے پاس مزید دو گھنٹے تھے پھر
 اسے اپنی جاب پر جانا تھا۔

”کیسا ہے؟“ ویرا نے اسکیچ اس کے آگے کیا۔
 ”زبردست۔ پر اس کا کوئی کیا؟“
 ”بہت ہی خاص دن پہنوں گی۔“
 ”اپنی شادی پر۔۔۔؟“
 ”اس سے بھی خاص دن۔۔۔“

”شلوی سے بڑھ کر خاص دن اور کیا ہو سکتا ہے
 ۔۔۔ کاؤ کیشن پر۔۔۔؟“

”میرے نزدیک شادی سے بھی زیادہ ایک اور دن
 بہت زیادہ خاص ہوتا ہے کسی لڑکی کے لیے۔ جب
 اسے لگتا ہے کہ اسے دو زندگیوں کے ٹریکیس کو ایک کر
 دینا چاہیے۔۔۔ جب وہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے اپنی
 زندگی میں کسی اور ایک اپنے ہی جیسے بے حد اہم اور
 اکلوتے انسان کو شامل کرنا ہے۔۔۔ یعنی وہ وقت جب دو
 لوگ بالآخر یہ طے کر لیتے ہیں کہ ان میں بادشاہ کون ہے

بلکہ رات تک۔۔۔
 ”اپنا یہ منہ ایسے ہی پھلائے رکھنا لیکن کھولناست“
 میں یہاں مخصوص طرز کا ایک لباس ڈھونڈنے آئی
 ہوں۔ جب وہ مل جائے گا تو بالی کی تفصیل بھی بتا دوں
 گی۔ تم چاہو تو الگ سے گیلری کو دیکھ سکتی ہو۔ خاص ہو
 کر میں تمہیں ڈھونڈ لوں گی۔“ ویرا چیونٹی کی رفتار سے
 ایک ایک شوکیس کے آگے سے سرک رہی تھی۔ وہ
 لاٹویا یا سوئیڈن کے سیشن میں تھی۔

نہ صرف انچسٹر بلکہ پورے برطانیہ میں ”دی گیلری
 آف کسٹم ڈوسز“ اپنی انفرادیت میں یکساں حیثیت کی
 مالک گیلری ہے۔ گیلری میں ہزاروں سے زائد آٹم
 رکھتی ہے۔ لیٹ 17s سے اب تک کے فیشن کے
 مودانہ ”ڈائن“ بچکانہ کپڑے، جوئے، زیورات اور ایسی
 ہی وہ سری چیزیں بڑے پیمانے پر کاسٹوم ہاؤس میں
 نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ یعنی یہ ہاؤس ایسی
 سب چیزوں کا جدید طرز سے سجا ہوا ہے۔ ظاہر
 ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے خاص طور پر 17s-
 18s-19s کے حصے دیکھنے سے تعلق رکھتے
 ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ کبھی یورپ میں بھی خواتین
 نے دستاویز پنئے تھے۔ اسکاٹف کے استعمال کو لباس
 کی طرح ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ایسے گھیراؤ لباس پہنے
 جاتے تھے کہ اصل جسامت کے بارے میں اندازہ
 نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ تو پھر ایسے پیارے ملبوسات سے
 انہوں نے کیونکر اپنی جان چھڑائی۔؟ ترک کیوں کر
 لے لے؟

تغییر وقت کی اصطلاح ہے۔ اور بلاشبہ آنے والا وقت
 گزر جانے والے وقت سے بدتر ہوتا ہے۔ ہوتا
 رہے گا۔ ایسا ہی فرمایا گیا ہے۔

لن ملبوسات نے امرتہ کو مبہوت کر دیا۔ وہ بے حد
 نفاست سے سلائی کیے گئے تھے۔ انہیں پہننے سے زیادہ
 دیکھتے رہنے کو دل چاہتا۔ موی تیلے جو انہیں پہنے
 کمرے تھے۔ سانس لیتے گتے اور دیکھنے والوں کو اپنے
 ساتھ وقت کے تغیر کے سفر پر جانے پر مجبور کر دیتے۔
 ۔۔۔ امرتہ نے لن کے ساتھ وقت کا سفر کیا۔

اور ملکہ کون۔ "آخری فہرہ ویرانے نچلے لب کا کونا
واپس میں لے کر شرارت سے چھوڑتے ہوئے کہا۔
"جب کوئی تمہیں پروپوز کرے گا اس دن؟"
ویرا دل کھول کر ہنسی۔ "یہاں میں نے تھوڑی
سی تبدیلی کر دی ہے۔ جس دن میں اسے پروپوز
کروں گی۔ اس دن۔ جس دن تم مجھے اس سے ملے۔"
اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھو، سمجھ لیتا میں
مگر کہ سر کر آتی ہوں۔"

امرد کو اس کا اعلیٰ اچھا لگا۔ وہ جانتی تھی اسے
پروپوز کیا نہیں جائے گا بلکہ یہ اہم کام وہ خود کرنا پسند
کرے گی۔ ایک فراق امرد کو بھی بہت پسند آتی
تھی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی تھی جس پر ہلکے نیلے سرخ
پیلے پروں والی غلیوں کو ایسے بنایا گیا تھا جسے وہ ایک
سرے کے آگے پیچھے بھانکتی مددگار شرارتیں کرتی
تھیں۔

امرد اس فراق کو اپنے سب سے خاص دن اپنی
شادی کے دن نصب تن کرنے کی خواہش کو اپنے اندر
سدا ہونے سے نہ روک سکی۔ یہ خواہش اچھا لگا اس
کے اندر جاگ اُور نہ اس نے بھی اپنی شادی کے بارے
میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا اس نے تو کبھی اس شخص
کے بارے میں نہیں سوچا تھا جسے کبھی تو اس کی زندگی
میں آنا ہی تھا۔ اس کی منگنی ہوئی تو بھی اسے کوئی رہنمائی
پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ کون شخص ہے۔ اسے صرف
اپنے گھر کے ماحول سے اپنے آپ کو اس کے ماحول سے
ٹکٹے میں دیکھیں تھی۔ حتیٰ کہ اس کی شادی بھی طے ہو
گئی تب بھی اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش
نہیں کی کہ وہ کون ہے کیا ہے۔

اس نے کئی بار اس بارے میں سوچا کہ ایک دوا
کے علاوہ کیوں باقی سب سے لا تعلقی رہتی ہے۔
ان کے ساتھ تعلقی کیوں نہیں بن پاتی۔ اس کی
"دشمن دور دور سے" دشمن ہی کیوں رہتی ہیں وہ ان
کے اور قریب کیوں نہیں جا پاتی؟

اس نے داوا کو یہ سب بتایا تو وہ خاموش سے ہو
گئے اس وقت تو نہیں لیکن آگے دنوں میں داوا

نے اسے بتایا کہ وہ ایسا اس لیے کرتی ہے کیونکہ آج
تک سب نے اسے تکلیف ہی دی ہے۔ اسے سب
انسان ایک جیسے لگتے ہیں صرف تکلیف دینے والے
۔ اندر کے اس دہم اور خوف کی وجہ سے اسے کوئی
اتنا اچھا لگتا ہی نہیں کہ وہ اس کی ذات میں دلچسپی لے
اس سے انتظار ہے کارنگا بڑھائے۔

ویرا ویرا Plott Field یاد رکھ آگے
سینڈویچز اور کوک این کے ہاتھ میں تھی۔ چلتے چلتے
ایک دم سے ویرا اچھٹی اور ساتھ ہی مدھی زبان میں گل
دی۔ پھر تیزی سے بالکل سپرین کی طرح اڑ کر جھلانگ
لگا کر اس کے منگ کر تے ایک سپر ہوپ ہوائے کو گردن
سے جالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پر لائنوں میں نوسوں اور
گالیوں کی بو چھاڑ کر دی پھر اس نے اس ٹرکے کو کسی
پلی کے بلو ٹرے کی طرح اٹھایا اور جمیل کے ٹھنڈے
پانی میں اچھالا دیا شواپ کی آواز آئی اور کنارے پر
لکڑی ویرا انگلی اس بلو ٹرے کی طرف لہرا کر اسے
مزید انقلابات سے نوازتی رہی۔

ویرا کے غصے اور ان کی لہرائے کی رفتار کو دیکھ کر امرد
اندازہ لگا سکتی تھی کہ مدھی زبان میں اس وقت کیا نشر کیا
جا رہا تھا۔ بلو ٹرے نے پانی میں ڈبکی لگائی اور تیزی سے
ہاتھ چار بار تار سرے کنارے سے نکل کر بھاگ گیا۔
"کیا کیا تھا اس پہاڑی بکرے نے؟" امرد کو اس
کے بھاگنے کے انداز پر بہت ہنسی آئی۔
"میری کمر چٹکی بھر کر کیا تھا۔"

"تم نے کیسے اس پر تشدد کیا۔ اسے ٹھنڈے پانی
میں پھینک دیا۔ کوئی مسئلہ ہو گیا تو وہ پولیس لے
آتا تو۔"

"پولیس لے آئے یا فوج ہمیں تیار ہوں۔ ایک
بار اسکول گراؤنڈ میں میرے ایک کلاس فیلو نے مجھے
ہراساں کیا تھا۔ میں دس سال کی تھی اس وقت۔ وہ
ایک لوفراور گندالو کا تھا اور اسکول کی ہر کمزور لڑکی اس
سے ڈرتی تھی۔ اگلے دن خوف سے میں اسکول نہیں
گئی۔ میرے پیپا کو میرے اسکول نہ جانے کی وجہ معلوم
ہوئی تو انہوں نے مجھے گھر کے باہر پہاڑ کی طرح جمی

برف میں گرہن تک نہ دیا۔ میرے بدن پر ایک بھی گرم کپڑا نہیں تھا۔ میں چیخنے اور چلانے لگی۔ خاموشی سے میرے پاس بیٹھے رہے۔ جب میں بالکل مرنے کے قریب ہو گئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ برف کے اس ذخیرہ میں وہ رہتا ہوں؟ یہ ہے یا اس کوں سے چھٹی کر لیتا ہے؟ ہم نماز خول اور برہنہ کی بنا پر۔۔۔ مجھ سے ہمارے ایک سوال پوچھتے رہے۔ میرے ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ اور میری جان نکلنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر تم نے باقی ماندہ زندگی بھی ایسے بزدل بن کر گزار دی ہے تو خود کو اسی برف میں دفن رہنے دو۔ مرنا تو اسی ذخیرہ میں۔۔۔ برہنہ کو مر ہی جانا چاہیے۔

امرد دنگویر کی شکل دیکھ رہی تھی۔
"دوس کی ٹھنڈ اور برف کے بارے میں جانتی ہو؟"

"ہاں۔۔۔!" امرد نے ساتھ اور اندر سے سر بھی ہلایا۔
"کیا؟"

"ٹھنڈ ٹھنڈ ہوتی ہے۔ برف برف ہوتی ہے۔ کیا جواب دیتا تھا اس نے۔
"ٹھنڈ ٹھنڈ نہیں ہوتی، برف برف نہیں ہوتی۔ امرد۔۔۔ موت ہوتی ہے۔ سفید موت۔۔۔ سردیوں میں پانی پھینکو تو وہ ہیں فضا میں ہی جم جائے۔۔۔ تمہارے گرم ٹکڑوں کے لوگ وہاں جاتے ہی مرنے سے گتے ہیں ویسے تمہاری رضا کے بارے میں معلومات اتنی کم کیوں ہے؟"

"میں جانتی ہوں، دوس کہیں ہے۔"
"دوس میں کیا کیسا ہے؟ یہ جانتی ہو؟"

"پاکستان میں کیا کیا نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔۔۔ تم کیا چاہتی ہو میں فضا سے بات شروع کروں یا عہد اقدار سے۔ کو تو میں کہو کہ ہمارے میں بھی بہت کچھ جاسکتی ہوں۔ میں تمہیں تمہارے ان چند شہروں کے نام بھی بتا سکتی ہوں جو زیر زمین ہٹول کے

دورا رکھتے ہیں لیکن جن کے بارے میں خود پاکستانی نہیں جانتے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔۔۔ صرف ان پر پور نہیں کولتے ہیں جو انہیں نام نماز غیر ملکی بنا کر دیتے ہیں۔۔۔ میں چاہتی کہ پاکستان ان ذرا خیروں کو استعمال میں لا کر ترقی کرے۔۔۔ ایسا تب کریں گے جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ ان درختوں کے نکلنے ہی انہیں ان کے ٹھیکے مل جائیں گے یا ان پر ان کا قبضہ ہو سکے گا۔۔۔ ہمارے دوس میں ایک بات کہی جاتی ہے کہ پاکستانی اس وقت سیلوٹ کیے جاتے کے لائق تھے جب وہ ہندوستانی سے پاکستانی بنے تھے۔ اور تب جب وہ ایک ایسی طاقت بنے تھے۔ اور بس۔۔۔ پاکستانیوں نے یہ سیلوٹ دیا یہ نہیں ملتا۔"

امرد جانتی تھی کہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ خود امرد کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ پاکستان ایسی طاقت کس سن میں بنے۔

"تم نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی کر دیا۔" امرد کو اسے پرانے موضوع پر واپس لانا چاہا۔ وہ مزید دیر کے سامنے شرمندہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ پاکستان کو لے کر کوئی عام سادی سوال پوچھتی تو اسے اس کا بھی جواب نہ آتا تو۔ تو برا ہوتا۔ کم سے کم ایک پاکستانی کو تو پاکستان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ "زیادہ نہیں بلکہ بالکل ٹھیک کیا۔ ٹھنڈے پانی نے اس کی اندر کے گندے کپڑے کو بھگو بھگو کر نکال ڈالا ہو گا۔"

"تم بہت بہادر ہو رہی۔!"
"اگر مجھے ایسے برف میں دلیا نہ جاتا تو میں کبھی ایسی بہادر نہ ہوتی۔"

ایک لمحے کے لیے امرد بالکل خاموش ہی ہو گئی۔ ایک دیر انہی جیسے بہادر بنایا گیا تھا۔ ایک امرد جسے مسل مسل دلایا گیا تھا۔ وہ دونوں انسان تھیں۔ لڑکیاں۔ لیکن ان میں سے ایک کئی گنا مضبوط اور کئی قدم آگے تھی اور دوسری کئی گنا کمزور اور بہت پیچھے تھی۔ دونوں انسان ہی تھیں پھر بھی برابر نہیں

تھیں۔
”تو تمہارے غلوں تمہاری طاقت ہیں؟“ امردہ کو اس پر رشک آ رہا تھا۔

”وہ میرے استاد ہیں۔ انہوں نے اپنی طاقت مجھے نہیں دی بلکہ میرے اندر کی طاقت کو میرے اندر بیدار کیا ہے۔ جب ایک باپ اپنی بیٹی کے اندر اس طاقت کو بیدار کرتا ہے تو وہ زندگی کے ہر بڑے میدان میں فلاح بخنے کے لیے اپنی بیٹی کو تیار کر لیتا ہے۔ اور یہ پاور صرف ایک باپ اپنی بیٹی کو دے سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے سکھایا کہ بڑی اور بہادری دونوں کا تعلق داغ سے ہے جسم سے نہیں۔ اگر داغ کو اندر ہٹا لیا جائے تو جسم ہرگز ڈر پوک نہیں بنتا۔ وہ کہتے ہیں نا کوئی آپ کو انگلی لہرا کر دھمکائے آپ اسے مکار کر خاموش کر دیتے ہیں۔“

”تمہیں کوئی بھی رد عمل میں نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے تو کیا نقصان کے خوف سے میں بڑی بی بیوں خاموش رہوں۔ ایسا میں نہیں کر سکتی۔ ویسے تمہیں تمہارے پیارے کیا سکھایا ہے امردہ؟“

ایک گہرا سلیہ امردہ کے چہرے پر سے ہو کر گزرا۔
”بیارات گئے گھر آتے تھے انہیں دنیا میں ایک ہی چیز کی فکر رہتی تھی اپنی گارنٹ شاپ کی۔ وہاں رگے چھوٹے بڑے ہر گارنٹ کی بیگمات کے گھر وقت پر ڈیوری کی۔ حتیٰ کہ شاپ پر فیوز ہو جانے والے آخری سیور تک کی بھی۔ یونیفارم میں ایک دن صبح وہ دن کے سامنے اپنی دین کے لیے نکلنے لگی تو انہوں نے پوچھا۔“

”کتنے بچے چھٹی ہوئی ہے تمہاری اسکول سے؟“
”میں اسکول نہیں کالج جاتی ہوں اب۔“ کہہ کر وہ دین میں آ کر بیٹھ گئی اور بمشکل اپنے رونے پر قابو پا کر۔ جس باپ کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیٹی اسکول نہیں کالج جاتی ہے وہ باپ اس کی تکلیفوں کے بارے میں کیسے جان سکتا تھا۔ جس باپ کی بابت

وہ پوچھ رہی تھی وہ باپ اس کے لیے داوا بنے تھے۔
”میں بارہ سال کی تھی اور میری طرح سے دو رہی تھی۔ میرے داوا مجھے ایک بہت بڑے پارک میں لے گئے۔ وہ سال کے گرم ترین دنوں میں سے ایک دن تھا۔ کیا تم گرم ترین دنوں کا مطلب جانتی ہو؟“ امردہ نے رک کر پوچھا۔

”ہاں! لگتا گرم کہ انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔“ وہ سب جانتی تھی۔

”ہاں یہ وہی دن تھے۔ پارک میں لے جا کر میرے داوا نے مجھے وہ مود پر مٹے دکھائے جو گرمی سے مر چکے تھے۔ وہ مجھے ایک درخت کے نیچے لے کر بیٹھ گئے اور انہوں نے مجھے پرندوں کو دیکھتے رہنے کے لیے کہا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چڑیا گرمی کی تاب نہ لا کر مر گئی۔ میرے داوا مجھے اس کے قریب لے گئے اور مجھ سے پوچھا۔“

”امردہ! مرنے سے پہلے کیا تم نے اس چڑیا کو دیکھا۔“
”آؤ دیکھا شکوے شکایتیں کرتے دیکھا۔ گرمی نے اسے اتنی تکلیف دی۔ کیا اس کی میٹھی چوں چوں بھدی آواز میں بدلی۔ بلکہ یہ بے چاری تو خاموش ہو گئی پھر تو یہ معصوم سی چڑیا انسانوں سے بڑھ کر ہو گئی۔“

داوا نے چند چھوٹے ٹکڑاٹھا کر پرندوں کو مارے۔ وہ خاموشی سے پھر سے اڑ گئے۔ انہوں نے اپنی جگہ بدل لی لیکن داوا بڑھ گیا۔ نہ روئے نہ چلائے۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ کائنات کی اپنی تخلیق حشرات پرندے اور دوسرے جانور بھی انسان کی طرح آواز کا نہیں کرتے۔ انسان کی طرح روتے چلاتے نہیں۔ داوا نہیں بچاتے۔ لیکن کائنات کی ارفع و اعلیٰ مخلوق انسان یہ کام بہت شوق سے کرتا ہے ایسے گلا بھاڑتا ہے سینہ کھول کر تا ہے جیسے کائنات کے رب نے ظلم کے دکھوں کے سب ہی پہاڑ اس پر توڑ ڈالے ہیں۔ ایک اکیلا وہی تکلیف اٹھا رہا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ دکھ یہ تکلیف اسے کتنا فائدہ دے رہی ہیں۔ اس کی استخوانی اسے کیا کیا کچھ سکھا رہی ہے۔ بس وہ

روئے چلا جاتا ہے۔
"تو تمہارے دادا کے پاس ساری مشقی حکمت ہے!"
پھولے نہیں سمائے تھے۔
"بڑے اچھے لوگ ہیں امجد ایہ سب تو۔" بہت خوش ہوئے۔

"ہاں جی! بہت ہی زیادہ اچھے۔" وہ قہقہہ لگائی۔
اس نے دادا کو آکس لینڈ کی وہ خاتون بھی دکھائیں جو وہ کم ستر سال کی عمر میں باسٹو کر رہی تھیں اور یونیورسٹی کے جانی اسٹوڈنٹس اور اپنی کلاس کے پروفیسرز سے یہ درخواست کر لی جانی تھیں کہ ان کی عمر کو بلائے طاق رکھ کر انہیں بھی دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح عام اسٹوڈنٹ سمجھا جائے انہیں کوئی رعایت نہ دی جائے۔ وہ اس وقت بھی برلن جاتی تھیں۔ جب لاہور میں کوئی فن سے یہ کہتا تھا کہ وہ چھپا آٹھ کتابوں پر مشتمل سیٹ کو ان کے ہاسٹل روم تک چھوڑ آتا ہے۔ یونیورسٹی اسٹاف کو ان سے بہت توقعات تھیں اور سب کا ماننا تھا کہ وہ ضرور دنیا بھر میں بائیسٹرو یونیورسٹی کا نام روشن کریں گی اور کالو کیشن اے پر یقیناً دنیا بھر کا میڈیا مسز دھیل کی شاندار کہلیالی کو کورنگ کرنا فرض سمجھے گا۔
"دادا! آپ بھی آجائیں۔ یہاں چھوٹا مونا کوئی کورس ہی کر لیں۔"

"اس عمر میں کیا کروں گا کورس کر کے۔"
"یہی سوال میں نے بھی مسز دھیل سے پوچھا تھا کہ اس عمر میں تاریخ کو کھنکھل کر اس میں گھس کر اور پھر اس میں ڈگری لے کر وہ کیا کریں گی تو انہوں نے کہا۔"
عمر۔ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اصل چیز زندگی ہوتی ہے۔ اور میرے وجود میں زندگی ایسے ہی لاڈلی ہے جیسے کسی لومولود کے جسم میں۔ تو جب زندگی کا معنی ایک ہے "زندہ رہنا" تو میں کسی شاندار مقصد کو لے کر زندہ کیوں نہ رہوں۔ اس سے پہلے میرا مقصد میرے بچوں میرے خاندان کی پرورش اور دیکھ بھال تھا جب میں اس سے فاصلہ ہو گئی تو میں نے ایک نیا مقصد اپنا لیا۔ اس میں عمر اور نفع نقصان کی بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو مقصد کو پالنے کی بات ہے جو میں پال رہی ہوں۔"

"نہیں۔ ان کے پاس صبر اور علم ہے تھوڑا سا۔
وہ ایک اچھے استور ہے ہیں اور میں ایک بری شاگرد۔ ہم اپنے استو کو ہاں با کام کر دیتے ہیں جب ہم اس کی سنتے ہیں لیکن ہانتے نہیں۔ ہر دن ہر رات وہ مجھے ایسی ہی باتیں سناتے لیکن میں نے تو اپنے وجود کو جیسے پتھر کا بنا لیا تھا۔ قسطو قسطو سوچو جو جھ کی کوئی بھی پوند اس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ لب تم سب کو دیکھتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ اپنی زندگی کن اندھیوں میں گزارتی رہی ہوں۔ سزا سی امت کرتی تو ان اندھیوں سے نکل سکتی تھی۔"

"کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ ماضی میں؟ کچھ بہت برا؟"

"تم سنو گی تو ہنسو گی۔"
"میں ہنستا چاہتی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن بتاتے بتاتے میں مد پڑوں گی۔" اس نے بھی سنجیدگی سے ہی کہا۔
جھیل میں بطنیں ایسے سکون سے تیر رہی تھیں جس سکون سے انسان کلو اسطہ کم ہی پڑتا ہے۔

"Skype is God send"

اور وہ اس کی ٹاکل بھی تھی۔ دادا ہر دن اس سے بات کر کے اسے دیکھ کر ہی سوتے تھے۔ اس نے موبائل لے لیا تھا اور چلتے پھرتے ہر اوقات میں دادا سے اسکا ٹپ پر بات کر لیا کرتی انہیں دیکھ لیا کرتی موبائل کے ذریعے ہی اس نے دادا کو اپنی کلاس اپنی کلاس فیلوز اور یونیورسٹی دکھائی تھی۔ کلاس میں سر کے آٹے سے پہلے اس کی کلاس فیلوز نے ہاتھ لہرا کر ایک زبان ہو کر کہا تھا۔

"ہیلو گرینڈپا! ہیلو گرینڈپا! اتنے خوش ہوئے تھے کہ

"لوہ۔۔۔ ساوھنا نے۔۔۔ فون آیا تھا اس کا میک
ہٹنے کی ترکیب پوچھ رہی تھی مجھ سے۔۔۔"
"آخر یہ برطانوی لوگوں کو گھر میں بکنگ کرنے کا
جنون کیوں ہے؟"

"ساوھنا بندو سہلی ہے۔" اس نے اطاعت گزار
بچوں کی طرح ایسے کہا کہ اسے پرانہ لگے۔

امرد نے اس کے لئے گلہ تے میں سے جو کسی
بلخ سے توڑے لگتے تھے سفید 'پیلے' سرخ پھول جن
لے اور پیلے پھول اسے واپس کر دیے۔ "سالہ اسے
دیکھنے لگا۔ دونوں لب پونڈور شی کی مخراب کے پیچھے
کھڑے تھے۔ سامنے آکسفورڈ روڈ والے دروازے تھے۔

"یہ واپس کیوں کیے؟" عالیان کو برا لگا۔

"پیلے پھول کسی کو نہیں دیتے۔ یہ ناپسندیدگی اور
نفرت کی علامت ہوتے ہیں۔ ہم بہت اچھے دوست
نہ سہی ایسے دشمن بھی نہیں ہیں کہ مجھے میری سالگرہ
کے دن یہ پھول دے جائیں اور۔۔۔"

"نفرت ناپسندیدگی کی علامت یہ پھول؟" وہ بھرپور
سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں بالکل!۔۔۔" وہ بھی مکمل سنجیدگی سے جواب دے
رہی تھی۔

"تم سے کس نے کہا یہ امرد؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا کہ کس نے کہا؟"
پونڈور شی کی تاریخی مخراب کے نیچے ایک نئی کلاس لگی
تھی۔

"تم سے یہ کس نے کہا کہ یہ نفرت اور ناپسندیدگی
کی علامت ہیں؟"

"سب کو معلوم ہے یہ۔" اس نے ایسے کندھے

اچکائے جیسے اسے یہ بتا رہی ہو کہ کتنی ہی تمہیں اتنی سی
بات نہیں معلوم۔ السوس۔ ویسے تم بڑے ماسٹر
مانڈ بنے ہو۔

"سب کون؟"

"آلہ یہ ساری دنیا۔ سب۔ اور کون۔"

ایک دم سے امرد کے تاثرات میں غصے اور کوفت

کا گراف بڑھنے لگا۔ بھرپور سے دل سے قہقہہ لگایا۔

دوا اسے سالگرہوش کر رہے تھے جب وہ کچن
میں ساوھنا کے ساتھ ناشتا بنا رہی تھی۔ اس نے
سوباگل اسٹینڈ میں سوباگل لگا دیا تھا اور کام کرتے
ساتھ ان سے باتیں کر رہی تھی۔ ساوھنا نے سنا تو
اسے گلے سے لگایا اور کیک بنانے کا وعدہ کیا۔ ویرا
نے فی الحال ایک سرخ رنگ کا رین اس کی کلائی پر
باندھ دیا اور ایک اپنی کلائی میں کہ دونوں کو یاد رہے کہ
ایک نے گفت لینا ہے اور دوسرے نے دینا ہے۔ اس
اولن نے بھی جیسے اپنا علامتی جب کارڈ توڑا اور اسے
جاپانی گیت گا کر پیش کیا۔ نشست گاہ میں کسی چھوٹی بچی
کی طرح ہل بل کر گیت گاتی وہ ان تین خواتین کو
حیران کر رہی تھی۔ لیڈی مہرا سے ٹھوڑی تلے ہاتھ
دکھو۔ کھتی رہیں۔ جب وہ گا چکی تو لیڈی مہرا نے پر زور
سہلا کر کہا۔

"مجھے امید تھی کہ تمہارے اندر بھی کوئی نہ کوئی کلا
ضرور موجود ہے۔ رات کو مجھے تم چند ایسے ہی گیت
سنانا۔"

امرد کے ہاتھ پر کس کر کے اسے اولن بھر سے برائی
اسے اولن بن گئی جو سال میں ایک بار مشکل سے کوئی غیر
ضروری بات کیا کرتی تھی۔ لیڈی مہرا نے رات کے آخر
کے اہتمام کا امرد سے وعدہ کیا۔

اور پونڈور شی میں رنگ برنگے پھول لیے کئی اس کا
خطرہ تھا۔ وہ اپنی کلاسز لے چکی تھی اور اپنے ڈیپارٹمنٹ
کی حدود سے آگئی تھی کہ عالیان ایک دم سے اس
کے آگے آگیا۔ شاید بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"یہ لو۔ وقت تمہیں زندہ رکھے۔"

"وقت مجھے زندہ رکھے۔" وہ زرا نہ کبھی۔

"تمہاری سالگرہ ہے نا آج تو تمہیں دعا دے رہا

ہوں جسے وقت زندہ رکھتا ہے اس کی عمر ہزاروں

سال۔ کئی صدیاں ہوئی ہے۔"

"مکراتے لگی۔" تمہیں کس نے بتایا؟"

"میں نے خود کو خود ہی بتایا۔" اسے لگا اس کی

تعریف کی گئی ہے۔

"میری سالگرہ کا کس نے بتایا پگل۔"

قدرت کو باخوش کرنے کے لیے لکھا ہے۔ قدرت کو بچ کرنے کے لیے لکھا ہے۔

امرد حقیقتاً "چپ ہو چکی تھی۔ اس کی ساری زندگی پیلے پھول کو قدرت کی علامت سمجھتے گزر جاتی۔ اگر اسے یہ سب نہ بتایا جا رہا ہو تو آخر اس نے آج تک یہ بات خود کیوں نہ سوچی۔ مانع تو اس کے پاس بھی تھا۔

"میرا ذاتی خیال ہے کہ پھولوں کے دو تاجروں کے کاروباری حسد کا نتیجہ ہے یہ سب۔ ایک تاجر کے پاس — پیلے پھول ہوں گے اور وہ کاروبار میں بہت ترقی کر رہا ہو گا۔ اس کے پیلے پھولوں کا بلغ تیزی سے پھل پھول رہا ہو گا۔ دوسرے کے کسی دوسرے رنگ کے ہوں گے چلو سسنگا لو۔ اب سس خ پھول کے مالک نے یہ سوچا ہو گا کہ پھول کو کسی ایسے جذبے کے ساتھ جوڑ دیا جائے کہ راتوں رات اس کی مانگ میں اضافہ ہو جائے اور اپنے کاروباری حلیف کے پھولوں کو کسی ایسے جذبے سے خشک کر دیا جائے کہ لوگ اسے لینا ہی پسند نہ کریں۔ اور پھر اس نے یہ کیا اور وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دیکھو! تم نے کیسے میرے ہاتھ میں میرے پھول واپس کر لیے۔ وہی پھول جو مجسم شاہکار ہیں۔"

امرد نے اس کے ہاتھ سے پھول واپس لے لیے۔ اور تیزی سے بس کی طرف بھاگی جس میں بیٹھ کر اسے جانتا تھا۔ علیان اس سے چند قدم دور تھا۔

"یہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے علیان؟" بس کی کھڑکی سے سر نکل کر اس نے پھولوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"میرا نے۔" علیان نے تیز آواز میں کہہ بس دھڑکی گئی تھی لیکن وہ وہیں کھڑا بس کی گزر گھ کو دیکھتا رہا۔

رات کے ڈنر کا اہتمام ٹھیک ٹھاک تھا۔ دادا کو تن لائن دیکھ کر اس نے سادھنا کا ہاتھ ایک کٹ لیا تھا۔ لیڈی سرے اسے یونیورسٹی کی تصویر دلا کر اس بیگ دیا تھا۔ سادھنا نے باریک سی پازیب اور این ایلن نے

"تم اتنی سلی ہو امرد۔ یا تم ان لوگوں کی باتوں پر دھیان دیتی رہی ہو جو قدرت اور انتشار کے موجد ہیں جو ہمیشہ قدرت کے قوانین میں سمجھتے ہیں اور پورے دل سے ان قوانین میں رد بدل کر رہا جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایک پھول بھی خود نہیں بنا سکتے لیکن اسی پھول کو ناپسندیدہ 'قلیل قدرت ضرور بنا سکتے ہیں۔ یہ علامت آخر کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ پھول ہے امرد! صرف پھول۔ اگر یہ اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے تو وہ یہ کہ یہ اپنے وجود میں کامل ہے۔ یہ خود کو خود ہی تحمل کرتا ہے۔ اس کا کھٹا ہوا رنگ دیکھو! اتنا کامل ہے۔ یہ اپنے رنگ میں نہ کہیں کم نہ کہیں زیادہ۔ ایک جیسا۔ اس کی ہنسی کھڑکیاں کتنی نرم اور ملائم ہیں کتنی جاذب نظر۔ کوئی ملاوٹ نہیں ان میں دنیا کی سترین ٹیکسٹریوں میں بننے والا ریشم بھی اس جتنا ملائم نہیں ہو گا جتنا یہ زمین کے وجود سے نکل کر ہوا ہے۔ دیکھو قدرت کی کاملیت۔ دلو! قدرت کو تعریف کرو قدرت کی۔ اناتم اسے ناپسندیدہ علامتیں دے رہی ہو تم نے اس کی خوب صورتی پر غور نہیں کیا اور اسے ناپسندیدہ جان لیا۔ سر اٹھا کر آسمان کو دیکھو! اگر ساری دنیا اس آسمان کو کوئی فضول اور بکو اس علامت قرار دے دے گی تو تم اسے بھی برا ماننے لگو گی۔ وسیع سمندر نیلی بھیلی سبز وسفید پھاڑ کتنے کامل ہیں۔ اگر انہیں بھی علامتیں دے دی گئیں تو کیا قدرت کرنے لگو گی ان سے۔ اپنی تخلیق میں یہ پھول کسی سے کم نہیں۔ کائنات کی کسی بھی شے سے۔

یہ اپنے مقام پر پوشلہ ہے۔ اس کے سر پر تاج ہے۔ اس کی تخلیق کا۔ کہ تمہاری تخلیق جیسی ہوتی منصور پائی بھی تمہارے ہی ہو۔ یہ کسی بھی طرح کیچ نہیں اس میں کوئی کمی نہیں۔ کی ہے تو ان عناصر میں جن میں یہ لتور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی پھول کوئی رنگ قدرت کی بتائی کوئی چیز قابل قدرت نہیں ہوتی۔ یہ طبی لوگوں کی باتیں ہیں۔ تم وہ سبق کیوں پڑھ رہی ہو جو دنیا کے مخلوق انھوں لوگوں نے غائب مافی میں لکھا ہے۔ قدرت کے خلاف جا کر لکھا ہے۔

کا جواب نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان ایسا نہیں سوچتے اس کا جواب اس کی ولوں اس کی ماں اور خاندان کے بانی لوگوں کے پاس تھا۔ وہ بتا سکتے تھے کہ قرآن و حدیث میں تو ایسا کچھ نہیں لکھا پھر وہ کہاں سے سیکھ سیکھ کر یہ سب کہتے اور کرتے ہیں اور یہ سب کرتے ہوئے کیا وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک بن ان کے کے ایک ایک لفظ کا حساب کتاب بھی ہو گا جو کہا ہو گا اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ وہ کون سا جواب گھڑ کر دیں گے۔ یہی کہ وہ کم عقل اور انجان تھے اور ان کے جواب کو درست نہیں مانا جائے گا کیونکہ جو کلام پاک پڑھتا ہے وہ نہ کم عقل ہوتا ہے نہ ہی انجان رہتا ہے اگر وہ ٹھیک ٹھیک پڑھتا ہے تو۔

”کیا مسئلہ ہے آپ کا؟“ انہیں پوچھا۔
 ”میں فریئر فلو کھنکھار ہوں۔“ نیا اسٹوڈنٹ
 ”لہ۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں۔ پر سکون
 رہا۔ وقت اس فلو کو مارل کر دے گا۔“
 وقت نے اس فلو کو مارل کر دیا تھا اور کمپوٹیشن
 نئے آنے والوں میں سے اس کے اثرات زائل ہو
 چکے تھے۔ ویلکم ویک کے بعد انہیں گاہے بگاہے یہ
 اصطلاح اپنے سینئرز اور پروفیسرز سے سننے کو ملی۔ کبھی
 طنزاً ”اور زیادہ تر خدا کا۔“ یونیورسٹی میں نئے آنے
 والے اسٹوڈنٹس کو مائچسٹر پونی اور شر کا جو بھلا پڑھتا
 ہے اسے فریئر فلو کہا جاتا ہے۔ اس فلو کے حامل فریئرز
 بہت بولتے ہیں۔ ایک صوم سے سب جان لینا چاہتے
 ہیں۔ رات رات بھر جاتے ہیں۔ بہت کھاتے ہیں۔
 بلا وجہ ہی یونیورسٹی میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔
 مائچسٹر ٹائٹ لائف سے ایسے لطف اندوز ہوتے ہیں
 جیسے بڑھنے نہیں سیاحت کرنے گھر سے نکلے ہیں۔
 شروع شروع میں جب وہ مائچسٹر پونی کا ایک چکر لگایا
 کرتی اور بلا وجہ ہی مختلف ڈپارٹمنٹس میں گھومتی
 پھرتی تو دائرہ و غیرہ کا گروپ اسے بہت سنجیدگی سے کہا

”اتھ سے بنی ایک پھولی سی گڑیا جو اس کی ماں نے اس
 کے بیک میں ایک درجن سے زیادہ رکھ دی تھیں کہ
 یونیورسٹی میں اسے جو چاہا لگے انہیں دتی جائے۔
 ایک اس نے لیڈی سرکوبی۔“

امرد نے اس گڑیا کو یونیورسٹی بیک کی اوپری سطر
 لگا دیا۔ سب کو معلوم ہونا چاہیے تاکہ این اون اسے
 پسند کرتی ہے۔

اس نے اپنے گھر میں کبھی ساگر نہیں کی تھی۔
 کیونکہ اسے اپنے دنیا میں آنے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔
 بلکہ اسے یہ سوچ کر ہی کوفت ہوتی تھی کہ وہ تاج کے
 دین پیدا ہوئی تھی۔ ایک ایسی تاریخ جسے وادی سال میں
 کتنی ہی بار دہرائی تھیں کہ اس دن یہ ہوئی تو یہ یہ ہوا۔
 اس نے سادھنا کو ایک بار ایسے ہی یہ سب بتایا تو وہ
 حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”لیکن تم تو مسلمان ہو امرد اور مسلمانوں میں تو یہ
 سب باتیں نہیں ہوتیں۔“

امرد اسے کیا بتائی کہ لب مسلمانوں میں بھی کیا کیا
 ہونے لگا ہے۔

”ہمارے محلے میں ایک مسلمان خاندان آباد تھا
 مجید بھائی تھے اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنا نیوٹن
 سینئر بھی چلاتے تھے ان کی بیٹی شادی ہوئی تو انہیں
 نوکری سے نکال دیا گیا۔ پھر اسی مہینے ان کے نیوٹن سینئر
 میں آگ لگ گئی اور پھر چند ہی دنوں بعد ان کے مکان
 کی چھت گر گئی۔ سب نے کہا۔ ”ہسو مینز قدم ہے“
 لیکن ان کی مائا اور وہ لگے سے جتے رہتے کہتے جو
 ہوتا ہے۔ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تین سال برابر
 ان کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوتا رہا لیکن انہوں نے کبھی
 ایک بار بھی لوگوں کی باتوں پر کان نہیں دھرے کہ یہ
 سب ان کی شادی کے بعد ان کی بیوی کے قدموں سے
 ہوا ہے وہ سب سے یہی کہتے کہ ہمارے مذہب نے
 ہمیں ایسا کہنے اور سوچنے سے منع کیا ہے۔“

سادھنا آتش دان کے قریب بیٹھی آریان کے
 موڑے بن رہی تھی اور بہت مدلل انداز سے اسے
 سب بتا رہی تھی۔ اس کے پاس سادھنا کے اس سوال

تھی۔ یعنی اچھی طرح کام کرنے کے لیے اسے معمول سے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت تھی۔

اسائنمنٹ مکمل کرنے اور جمع کروانے کے اس دوران میں یونی کے ہراسٹوڈنٹ کو دیکھ کر ایسا لگتا کہ اس بے چارے کا کچھ کھو گیا ہے اور وہ پوری جان دکا کر اسے تلاش کر رہا ہے یا ایک دنلی پتھر ان کے سولہ پر لگ رہا کسی بھی وقت گر سکتا ہے۔ ان دنوں اگر کوئی فضول پسند یا لٹا کیس نظر آجائے تو اس پر جی بھر کر رشک آتا کیونکہ وہ قابل لائق فائق اسٹوڈنٹس اپنی اسائنمنٹ مکمل کر چکا ہوتا۔ اسے دیکھ کر یہ عہد کیا جاتا کہ اگلے سمسٹر تک ہم بھی خود کو اسے ہی لائق فائق بنالیں گے کہ وہ سرے نہیں دیکھ کر رشک کیا کریں گے۔ اور یہ عہد پھر اگلے سمسٹر بھی کیے جاتے۔

امرد کو ہر حال میں اپنی کارکردگی بہتر کرنی تھی، اسے انگلش لٹریچر اور لسانیات میں ماسٹر کرنا مشکل لگ رہا تھا بلکہ بہت مشکل، لیکن وہ اپنے ہائی کلاس فیلوز کو دیکھتی تو سوچتی کہ یہ بھی تو تنہا ہی سے بڑھ ہی رہے ہیں نا۔ تو اسے بھی پڑھنا تھا۔ کیسے بھی کر کے پختہ فیصد تو اسے ہر حال میں پہلے سمسٹر میں لینے ہی تھے۔ یونی میں اس کی پہلی کلاس تھی سربراہٹ نے کلاس میں آکر اپنا تعارف کر لیا اور ان سب کے سامنے ہاتھ سے بنے کارڈ رکھ دیے۔

کارڈ پر ہل رنگ کے تھے جس پر پہلے رنگ سے UOM فرسٹ سمسٹر فرسٹ ڈی فرسٹ کلاس لکھا تھا اور کونے میں سربراہٹ کے خط تھے۔

”اس پر آپ سب اپنا نام اپنا تعارف لکھیں اور یہ بھی لکھیں کہ آپ سو فیصد میں سے کتنے فیصد کو پہنچا کرتے ہیں۔ اسی پہنچ پر اپنا مونو بھی لکھیں اور کارڈز مچھوا لیں کر دیں۔“

سب نے کارڈز لکھے اور پھر باری باری سربراہٹ نے کارڈز پڑھنے شروع کیے۔ جس کا کارڈ پڑھتے وہ کھڑا ہو جاتا اور ہاتھ ہلا کر سب کو ہائے کرتا۔

”یہ علی کس نے لکھی ہے۔“
امرد نے گردن کھما کر ایک نظر کلاس پر ڈالی۔

”تھوڑا دقت لگے گا لیکن ٹھیک ہو جائیگی۔ یونی بھاگی نہیں جا رہی۔ وہ سب ہیں تمہارے پاس آرام سے ایک ایک پروفیسر اسٹوڈنٹ ڈیپارٹمنٹ گارڈن لا بیری میوزیم گھوم پھر کر دیکھ لیتا۔ اپنے اس قلو کو تھوڑا کم کرنے کی کوشش کرو۔“

اتنی سنجیدگی سے کی گئی اس نصیحت کے باوجود وہ ہفتے میں دو بار تو ضروری یونی میوزیم جاتی۔ فاسٹ فوٹ لٹا تو وہ سرے ڈیپارٹمنٹس اور ہلنگ دیکھتی رہتی۔ لیکن اب چونکہ اس قلو کے اثرات زائل ہو چکے تھے اب تو اپنے ڈیپارٹمنٹ تک ہی چلی جاتی تھی تو بڑی بات لگتی تھی۔

جب جب اسے اسائنمنٹ ملتی اس کی جان پر ہن جاتی۔ اسے لگتا اس سے اسائنمنٹ نہیں ہوگی اور اسے یونی سے نکال دیا جائے گا فی الحال ابھی تک نکالا تو نہیں گیا تھا لیکن وہ اس نکالنے کے بارے میں سوچتی ضرور رہتی تھی۔ ایسے وقت میں پڑھائی ایک اڑدھان جاتی جو ہرپ کر جانے کے لیے تیار نظر آتی۔ پہلا سمسٹر اپنے اختتام کے قریب تھا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کتب اور نوٹا کوک نظر آتی۔ لائبریری کی طرف آمد و رفت ایسے تھی جیسے وہاں بے بنائے اسائنمنٹ مل رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہی پہلا سوال کیا جاتا۔

”اسائنمنٹ مکمل ہوگئی؟“

زیادہ تر کے منہ میں سہلا تے نظر آتے۔

”سراسول“ کتنے فیصد ہوگئی؟“

امرد کی کل ملا کر چھ اسائنمنٹس تھیں۔ چار پر کام مکمل کر چکی تھی پانچویں پر کام مکمل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ جو جون لٹن کی لوسٹ ہیڈ آئز کے کردار ’مائیکل‘ رائل اور شیطان کے مجسمے پر مشتمل تھا، جون لٹن کے کرداروں کو بڑھ لیتا کسی معرکے سے کم نہیں تھا۔ کہاں ان کے تجربے لکھا۔ جسے اچھی طرح اس Epic Poem کی ہی سمجھ نہیں آتی تھی وہ اچھی طرح اس پر کام کیسے کر سکتی

وہاں اسے تو کوئی اسٹوڈنٹ عرب سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھڑی ہو گئی۔

"یہ اردو ہو گی سر!" "مرد نے کارڈ کی اشارہ کیا۔ سر رابرٹ نے کارڈ کا رخ اس کی طرف کیا کہ وہ پہچان لے۔

"جی یہ میرا ہی کارڈ ہے۔"

"لیکن مجھے اردو پڑھنی نہیں آتی۔" سر رابرٹ نے مسکرا کر نرمی سے کہا۔

"آپ نے ہی تو کہا ہے سر! یہ ہمارا پہلا تعارف ہے اور میری بلوری زبان میرا پہلا تعارف ہے "اردو۔" مجھے اردو کا استعمال ہی کرنا چاہیے تھا سر۔" سر رابرٹ متاثر نظر آنے لگے۔

"یہ کارڈ یہاں آکر پڑھ کر سنا دیں۔ میں محذرت چاہتا ہوں میں فریج اور انٹلین جانتا ہوں۔ اردو نہیں۔"

وہ سر رابرٹ سے تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے قوی لباس شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ وہ اور پاکستانی لڑکیوں کے کارڈز سر رابرٹ بڑھ چکے تھے اور انہوں نے انگلش میں ہی کارڈز لکھے تھے۔ دلوایانے اس سے وعدہ لیا تھا کہ اپنی نئی کلاسز میں وہ اپنا تعارف پہلے اردو میں کروائے گی پھر ترجمہ کر کے انہیں انگلش میں اپنے کے کا مطلب بتائے گی۔ دلوایانے اسے بار بار یہی کہا تھا کہ زندگی میں سب کرنا۔ لیکن اپنی زبان کو وہ سرے فہرست لانے کی کستانی نہ کرنا۔ وہ کارڈ پڑھنے لگی۔

"میں امرت ہوں۔ میرا ملک پاکستان ہے جس کے تاریخی شہر لاہور کی میں رہائشی ہوں" مجھے مائیسٹر یونی کی پاکستان اسٹوڈنٹ سوسائٹی نے اس کا رشیدے کر میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ مائیسٹر یونی میری پہلی غیر ملکی درس گاہ ہے میں نے یہاں آکر پڑھنے کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میری پہلی کلاس دو حکم ویک تھی جن میں مجھے سکھایا گیا کہ مجھے اپنے کام خود کرنے ہیں۔ "پڑھ کر مسکراتے گی۔"

"ویل! آپ نے خود کو کتنے فیصد کا نتیجہ دیا ہے؟"

مسیو ٹی خانیو کا سر۔

جتنے بھی کارڈز میں نے اب تک پڑھے ہیں۔ انہوں نے خود کو سو فیصد کا دیا ہے "آپ نے خود کو سیو ٹی خانیو کا کیوں دیا ہے؟"

"یہ سب بہت ذہین ہوں گے۔ مجھے ذہین ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا اور ساری کلاس دل کھول کر اس کی معصومیت پر ہنسی۔

"آپ ذہین ہونے میں وقت کیوں لے رہی ہیں؟" سر رابرٹ نے اپنی ہنسی کو چھپاتے اس سے پوچھا۔ "میری بے وقوفی جانے میں وقت لے رہی ہے سر۔"

اس بار کلاس کے قہقہے فلک شکاف تھے۔ "مجھے لگتا ہے آپ مجھے بہت جگ کرنے والی ہیں۔ مجھے ہر سیشن میں ہی کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ملتا ہے۔"

"کیسا سر؟"

"جس کی بے وقوفی جانے میں وقت لیتی ہے۔" ہنسی کے نوادوں کا ایک اور ہم پھوٹا۔ وہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔

"آپ نے اپنا سوٹو نہیں بتایا۔"

وہ اپنی سیٹ پر کھڑی ہو گئی۔ اس کا اٹھنا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ "پاکستان کے بانی کہتے ہیں کام۔ کام۔ کام۔ میرا بھی یہی مولو ہے سر۔" نظرنہ لگے کیا انداز تھا مرد کا۔

"آپ کسی اور کاموں کو اپنا رہی ہیں۔ آپ کو اپنی سوچ کو اجاگر کرنا چاہیے یا آپ کو یہاں سکھایا جائے گا۔"

"سر! میں نے خود سے زیادہ عقل مند شخص کا مولو اپنا لیا ہے۔ اس پر عمل کر کے میں سب سیکھ جاؤں گی جو مجھے یہاں سکھایا جائے گا۔"

"آپ کا پہلا تعارف مجھے اچھا لگا مرد۔"

سر رابرٹ کے اس جملے کو سن کر اسے ایسا لگا جیسے اس نے کوئی بڑی مہم سر کر لی ہو۔ ٹھیک ہے اسے

ڈرنے کی گھبرانے کی ضرورت نہیں تھی وہ اپنی سوچ کو
ظہور میں کر سکتی تھی۔ سر رابرٹ نے اس کی تعریف
کی۔ اسے بہت اچھا لگا کہ اسے سراہا گیا ہے۔ لوگ انہیں
میلے اگر کبھی وہ دہائی میں اردو بول جاتی تو سر رابرٹ
بہت معذرت خواہانہ عرض کرتے۔

”امرد! کیا آپ اپنی بات کو انگلیش میں دہرا دیں گی؟“

امرد سر رابرٹ کی ماسی خلی کی بہت قدر کرتی تھی
کہ اگر وہ اپنی زبان کی عزت کرتے ہیں تو اس کی زبان
کی بھی کرتے ہیں۔ دنیا میں وہ قومیں بے مثال ترقی
ماصل کرتی ہیں جو اپنی قومی زبان کا دامن ہاتھ سے
چھوٹنے نہیں دیتیں، پھر وہ عرش ہو یا فرش ہر جگہ ان
کے نام کے جھنڈے کڑے ہوتے ہیں۔

سر رابرٹ نے اس کا راز سن لیا۔ سنبھل کر اپنے پاس
محفوظ کر لیے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ہر نئے
اسٹوڈنٹ کو ایسے کارڈ کی شکل میں اپنے پاس سنبھال کر
رکھ لیتے ہیں اور جب وہ بوڑھے ہو کر رٹائرڈ ہو جائیں
گے تو وہ ان کارڈز کو نکال نکال کر اپنے ہر اسٹوڈنٹ کو یاد
کیا کریں گے۔

اپنی سی بات سن کر امرد کی آنکھیں نم ہو
گئیں۔ اس نے مجھے بیٹھے بیٹھے سر رابرٹ کو جو مشکل
پیشکشیں مل کے گلتے تھے ہوڑھا ہوتے اور یونی سے
رٹائرڈ ہوتے دیکھ لیا اور اپنی ڈگری کو ہاتھ میں لیے خود
کو یونی سے رخصت ہوئے بھی۔

”گف۔ کتنے جذباتی لوگ ہیں نا ہم۔ ہاں لیکن
کچھ بھی ہے بہت اچھے لوگ ہیں ہم۔“ سر اور
فوس نہیں ہیں ترم اور پر جوش ہیں۔

پہلی کلاس کے پہلے وعدے کو امرد کو ہر صورت
پورا کرنا تھا وہ خود کو پختہ فیصلہ کا نتیجہ دے چکی تھی اسے
ہر عمل میں اس نتیجے میں کامیاب ہونا تھا۔ یہ حال اور
پھر طالب اسے لگتا تھا کہ ایک دیوبند میں چکی ہے۔
ہر وقت اس کے حلق میں مار کو اور جلیسن گھومتے
رہتے۔

کتاہوں کے بڑے بڑے ہیرا اگر ان کے خوابوں

میں آئے اور وہ اللہ کریمہ جانی لپ لپ کر اپنی
اسائنمنٹ چیک کرتی۔ کیا اس نے جواب میں آئے
پھر اگر ال کو اسائنمنٹ میں شامل کیا ہے۔ اگر کیا
ہے تو ٹھیک کیا ہے نا۔ اگر نہیں کیا تو کیا کرے کیا نہ

وہ اپنے ہیڈ پر کام کرتے کرتے سو جاتی۔ آنکھ کھلتی تو
کچن میں جا کر کھانسی پھانسی مگر ٹینڈ آئے اور پھر سے آ
کر کام کرنے لگتی۔

جس رات اس نے سارا کام بمشکل مکمل کیا اس
سے اگلا دن اسائنمنٹ جمع کروانے کا آخری دن تھا۔
وہ اپنی اسائنمنٹ پہلے ہی جمع کروا چکی تھی اس لیے
کنج پڑی سو رہی تھی۔ اسے وہ یہ سے بولی جانا تھا۔

غیند سے بوجھل اپنی آنکھوں کو مسلتے وہ بس سے
یونی کے لیے نکلی۔ بس میں بیٹھی اونچے گلی اور ایک
اسٹاپ آگے چلی گئی۔ وہاں اتر کر پیچھے بھاگتے وہ یونی
آئی۔ بھاگتے ہوئے یونی پارک کی اور فائل جمع کروانے
کے لیے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھی۔ ہر ایک کو جلدی
تھی کہ اس کی اسائنمنٹ جمع ہو جائے۔ ایک دم سے وہ
جہاں کی تہاں نہ گئی۔ اس کی فائل کہاں تھی وہ نہ گھر
سے لے کر نکلی تھی۔ وہ اتنی افراتفری میں تھی کہ اس
نے اپنے بل بھی ٹھیک سے پرش نہیں کیے تھے لیکن
اسے یاد تھا کہ وہ مونی فائل کو گھر سے لے کر نکلی تھی۔
پوری یونی اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔
وہ کئی راتوں سے نہیں سوئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے
گہرے حلقے بن چکے تھے۔ سر میں ہلکا سا درد رہنے لگا
تھا اور آنکھوں کی پتلیاں کسی ایک چیز کو ذرا سی دیر
دیکھتے رہنے کے بعد جھکنے لگتی تھیں۔ اس کا دل
بازو سا ہو گیا۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہاں سے اس نے
دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ فائل کیس کیس
تھی۔ آنکھوں کو مسلتے سر کو تھامتے وہ ایک جگہ بیٹھ گئی
اور سوچنے لگی کہ فائل کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ کہاں گئی
۔ سلاخ کو فون کیا اس نے اس کا کمر۔ پورا گھر
دیکھ لیا لیکن فائل نہیں ملی۔ حتیٰ کہ وہ گھر سے بس
اسٹاپ کے راستے تک بھی دیکھ گئی۔

یونیورسٹی کے سلسلہ میں ایک پروگرام نے اس کو کن
الفاظ میں دو ٹوک کیا تھا۔ وائٹ کا پیپر سن کر اس نے خود
سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مثال کامیابی حاصل کرے گی لیکن
وہ کیا کر رہی تھی۔ اس نے مثال محنت نہیں کی تھی۔
اس نے کافی کامیاب ہو کیا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ
رہا تھا۔ اس کی بری عادتیں اب تک اس کے ساتھ
تھیں۔

"تم چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسے مدتی کیوں ہو؟"
"یہ چھوٹی بات ہے؟" اس نے مدتی مدتی گھالی
آنکھوں کو دکھایا۔

"یونیورسٹی میں کہیں بھول گئی ہو اعلیٰ قائل؟"
اس نے اعلیٰ میں سر ہلایا اس کی آواز دھند رہی تھی
۔ اس لیے وہ کم سے کم بولنا چاہتی تھی۔ عالیان اسے
ڈیپارٹمنٹ سے باہر لے گیا اور بڑے پرے کر بیٹھ
گیا۔

"تمہاری قائل مل جائے گی امرہ! پر مجھے
تمہارے مدنے پر دکھ ہو رہا ہے۔ تم اتنی کم ہمت ہو؟"

"ہاں میں بہت کم ہمت ہوں۔ میرے تم لوگوں
جیسے مضبوط اعصاب نہیں ہیں۔"

"لوہر تمہیں غمزہ بھی ہے کہ تم ایسی ہو۔ میں
یونیورسٹی آفس جا رہا ہوں تم بیٹیں بیٹھو۔ اگر کسی
اسٹوڈنٹ کو وہ قائل ملی ہوگی تو اس نے آفس میں جمع
کرادی ہوگی۔"

"گوئی اسٹوڈنٹ میرے ساتھ ایسی ٹنگی کیوں کرے
گا بھلا؟"

"کیونکہ وہ قائل اس کے کسی کام کی نہیں ہوگی اور
اس کی تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہوگی۔" کہہ کر
عالیان چلا گیا۔

اسے یقین تھا کہ قائل بس میں رہ گئی ہے اور بھلا
ٹرانسپورٹ میں رہ جائے وہی چیزیں بھی کبھی کسی کو ملی
ہیں۔ اس نے دھواں دھار آواز کیے بغیر دل لگا کر رونا
شروع کر دیا۔

عالیان واپس آچکا تھا اور اس کے سر پر کھڑا خاموشی

ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔
اسے لگنے لگا کہ اس کی تعلیم پر اس کی اپنی نحوست کا
سایہ پڑا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے دنیاؤں کی ہو گئی۔
آنکھوں کے آگے اس نے ہاتھ رکھ لیا کہ کوئی اسے
دیکھ نہ سکے۔ بہت دنوں بعد اس کا حوالہ مارنے کو
ملی چلا رہا تھا۔ اگر وہ ساتھ ساتھ جا ب نہ کر رہی ہوتی تو
اب تک اسائنمنٹ مکمل کر کے دے چکی ہوتی۔
زندگی اتنی مشکل ہو گئی تھی کہ اسے ٹھیک سے کھانا
کھانے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ اسے ایسی زندگی کی
عادت نہیں تھی۔ اس لیے بھی وہ تو کزن نہیں رکھ پا
رہی تھی اور دوسرے اس میں ایک بری عادت تھی کہ
وہ کلام کو اگلے دن پر نکالتی رہتی تھی۔ وہ چند گھنٹے
اسائنمنٹ پر کام کرتی اور یہ سوچ کر کہ ڈیڈ لائن کے ختم
ہونے میں ابھی دن ہیں اگلے دن پر کام چھوڑ دیتی۔
کرتے کرتے وہ ڈیڈ لائن کے آخری گھنٹوں تک آ
جاتی۔

وہ اپنی سستی کو لے کر مدنے لگی کہ اگر وہ بھی باقی
سب کی طرح دن رات ایک کر کے کسی بھی طرح کم
سے کم دن پہلے اپنی اسائنمنٹ جمع کر دیتی تو
افرا تفری میں یہ سب نہ ہوتا۔ اٹھ کر اس نے اس
راستے کو بھی دیکھ لیا تھا جس پر سے چل کر وہ آگئی تھی۔
اپنے آنسوؤں کو صاف کر کے عالیان کے ڈیپارٹمنٹ
گئی۔

"کیا ہوا امرہ؟" اس کی شکل دیکھتے ہی وہ حیران سا
ہو گیا۔

"میری اسائنمنٹ نہیں مل رہی شاید میں بس میں
بھول آئی ہوں۔"

"تو تم مدتی رہی ہو؟"

اس کے پھر سے آنسو نکل آئے "میں ٹیل ہو
چلوں گی نا۔ میں ٹیل ہونا نہیں چاہتی عالیان۔"

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ "کس نے کہا تم ٹیل
ہو جاؤ گی۔"

وہ آنسوؤں کے دہلے کو اپنی آنکھوں کے پیچھے
دھکیلتے کی کوشش کرتے لگی۔ وہ اسے کیا بتائی کہ

ہوں۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔
وہ انہم کے پاس جا رہی تھی۔
"میں کوٹھے کھٹے میں آتا ہوں بامرد!" علیان نے
بیچھے سے گواہی دی۔

وہ انہم کے پاس گئی۔ اس نے اسے ٹرانسپورٹ
کے آفس جانے کے لیے کہا۔ ظاہر ہے۔ وہ انہم تو جانے
سے رہا۔ اسے ہی جانا تھا۔ اس میں تو اتنی ہمت نہیں
تھی کہ یونورسٹی کے مین گیٹ تک چلی جاتی۔
"اگر ٹرانسپورٹ کے آفس سے بھی نہ لی؟" اس
خیال کو سوچ سوچ کر دل رہی تھی لیکن اپنی جگہ سے
اٹھ نہیں رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب مین گیٹ سے بس اسٹاپ کی
طرف جا رہی تھی تو اسے علیان کی آواز سنائی دی۔ وہ
رک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ چیزی سے سائیکل چلاتا
اس کے پاس آ رہا تھا۔ وہی طرح سے ہاتھ رہا تھا۔
"یہ تو مل گئی۔" اس نے قائل اس کے آگے کی۔
قائل کو ہاتھ میں لے کر بھی امرد کو جیسے یقین
نہیں آیا۔

"کہاں سے ملی؟"
"ٹرانسپورٹ کے آفس سے۔" اگلے ہر قائل پر اپنا
نام "فلان نمبر" اور ایڈریس ضرور لکھتا۔ اگر تم نے
پہلے سے ہی لکھا ہوتا تو تمہیں اب تک یہ مل چکی
ہوتی۔" تیز سائیکل چلانے کی وجہ سے اس کے سانس
پھولا ہوا تھا۔

امرد اسے دیکھنے لگی۔ وہ انہم کی طرح اس نے اسے
نہیں کہا تھا کہ وہ جائے اور اپنا کام خود کرے۔ وہ گیا
اور اس نے اس کا کام کر دیا۔
اس کا شکریہ ادا کر کے وہ قائل جمع کروانے چلی گئی۔
اس نے محسوس کیا کہ اس کا انداز ٹھیک نہیں تھا
علیان سے بات کرنے کا۔

جب ہم بارے ہوئے تو کئی یا ماہوس ہوتے ہیں تو
ہم اتنے بد مزاج کیوں ہو جاتے ہیں۔ ہر سارا
اخلاق کہیں رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم روتے ہیں تو
ہمہمہ سب ہنستے ہوؤں کو رلانا کیوں چاہتے ہیں۔

سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"میں ٹرانسپورٹ آفس جا رہا ہوں۔ مجھے یقین
ہے وہاں سے ضرور تمہاری فائل مل جائے گی۔"
امرد نے علیان کو ایسے دکھا جیسے کہ وہی ہو
پاگل ہونا تھا۔
"اگر تم بس میں ہی بھول ہو ضرور مل جائے گی۔
میرا یقین کرنا۔"

"کہ کیوں میری فائل سنبھال کر رکھیں گے؟"
"یہ یونورسٹی بس ہے امرد! اور یہ کسواچھسٹر جیسی
یونورسٹی رکھتا ہے۔ اکثر اسٹوڈنٹس تمہاری طرح اپنی
ہمت کی چیزیں سب ویز "زام لور بسوں میں بھول
جاتے ہیں۔ کتنے ریٹورنٹ اور سیمیا میں بھی۔ ان
کی چیزیں ان تک پہنچ جاتی ہیں اکثر۔"
"میں نہیں مانتی کہ ایسا ہوتا ہو گا۔"

"ہاں! ایسا تب نہیں ہوتا جب ہم ان چیزوں کو
ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کم ہو جانے والی
چیزیں ہمیشہ گہری رہتی ہیں جب تک انہیں ڈھونڈنے
کی کوشش نہ کی جائے۔ پرامت مانتا یہ تمہارا اکثری
نہیں ہے جملہ تم کچھ بس میں بھول جاؤ تو وہ تمہیں
والہیں نہ ملے۔"

"تمہیں اتنے شفر سے میرے ملک کا ذکر نہیں کرنا
چاہیے۔" امرد نے قائل کے کم ہو جانے کا غصہ اس
پر اتارا۔
"میں نے شفر سے ذکر نہیں کیا۔ میں حقیقت بتا رہا
ہوں۔"

"مجھے نہیں جانتی کوئی حقیقت؟"
"جو لوگ سچ حقیقتیں جاننے کی کوشش نہیں
کرتے وہ انہیں بدلنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔"
"ٹھیک ہے۔ ساری اہلیت تم لوگوں کے پاس ہی
ہے۔ ہم سب ناکارہ ہی ہیں۔ رہنے دے ہمیں ناکارہ
ہی۔"

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی کہ تم ایسے ناراض
ہو۔"
"تم ایسی باتیں بھی نہیں کر رہے کہ میں خوش

دیکھا۔ "بھئی بھئی تم حد سے زیادہ بے وقوفی کر جاتی ہو۔"

"میں حد سے زیادہ بے وقوف ہوں۔"
"یہ کوئی قابل فخر بات نہیں ہے۔" ماں اور بیٹا دونوں ایک ہی بات کرتے تھے۔
"جانتی ہوں۔"

"میں آگئی۔" ویرا نے لشت نگاہ میں آکر چلا کر کہا۔ دراصل طوط کو دیکھا کر کہا۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی فرائگ پٹی تھی۔ اپنے لیے بالوں کو ٹیل کی صورت بنا کر حلقہ بنا کر ایک اپ کیا تھا اور خود کو اور پیار لہایا تھا۔

"اسے کسی کلب نہ لے جاؤ۔" لیڈی مہر نے تاکید کی۔

"مطلوم ہے مجھے ویسے بھی یہ کلب میٹرل نہیں ہے۔"
"تو تم بھی نہیں ہو۔"

"سب ہی جاتے ہیں۔ ایک یہ امرہ ہی نہیں جاتی۔" ویرا کسی قدر جھنجھکی۔

"جائے گی بھی نہیں۔ اس کے باپ دلوہا کی ہدایات نہیں ملے۔"

"تو برا کی کیا ہے اس میں؟"
"مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا ویرا۔ تم جاؤ، اللہ دیکھو اور گھر واپس آؤ۔"

لب ویرا کا یہ پہلے سے ارادہ تھا یا وہ صرف شرارت کر رہی تھی۔ وہ اسے کلب لے آئی۔ اس نے شی سینٹر میں واقع دی پرنٹ ورک کو کئی بار باہر سے دیکھا تھا، لیکن کبھی اندر نہیں گئی تھی۔ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کی پسندیدہ جگہوں میں سے ایک جگہ تھی۔ یہاں مختلف کیفے، بار، کلب، ریسٹورنٹ، جم اور اپنی طرز میں یکساں سینما موجود تھا۔ ویرا اسی سینما میں اسے فلم دکھانے لارہی تھی۔ دی پرنٹ ورک ایک چھوٹا سا ڈسکریٹ شہر لگتا، رنگا رنگ، چمک چمک اور مختلف ملکوں کے افراد کی بھیڑ سے سہا سہورا۔ "ہم سے ہے نہ؟" کا مہرہ لگا تا ہوا۔

اسائنمنٹس جمع کروانے کے بعد امرہ عالیہن کو اصرار کرتی رہی لیکن وہ اسے نہیں ملا۔ وہ جاچکا تھا۔ اس کا کلام ہو گیا تو اسے اپنے دماغ پر افسوس ہوا۔ اس کی فائل نہ ملتی تو وہ ایسے ہی بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتی رہتی؟
"یہ کمزور اعصاب کے مالک ہونے کی نشانی ہے۔"
لوہر بلاشبہ یہ کوئی اچھی نشانی نہیں ہے۔



"عالیہن سے ملاقات ہوتی ہے تمہاری؟" لیڈی مہر پوچھ رہی تھیں۔ سب آتش دہن کے پاس بیٹھے تھے۔ ویرا اسے اپنے ساتھ دی پرنٹ ورک لے کر جا رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر بیٹھی تھی۔ ویرا تو تیار ہو رہی تھی۔

"جی ہوتی ہے۔"
"دوست ہے تمہارا۔ سب سے اچھا دوست۔"
میرا بیٹا اچھا دوست بنتا ہے۔
"نہا۔ نہیں۔"

"تو کہہ رہا تھا تم اس کی دوست ہو۔ سب سے اچھی دوست۔"

امرد سوچنے لگی کہ کیا وہ اس کا سب سے اچھا دوست ہے۔

"تمہارے بابا کیسے ہیں؟ من کی شاپ جیٹ ہو گئی؟"

"جی۔ وہ جلد ہی آپ کا قرض واپس۔"
"بدحوہ۔ قرض کی بات کون کر رہا ہے۔" جیس لگتا ہے میں نے اس کے قصہ کو پایا کا تم سے پوچھا ہے۔ مجھے لگتا ہے مجھے خاموش ہو جانا چاہیے۔
امرد شرمندہ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ چیتل تبدیل کر کے انہوں نے چارلی چھلن کی سودی دنگلی لود ایسے دیکھنے لگیں جیسے اسکول سے پھنسی نہ کروائے جانے پر بچے خفا ہو کر والدین کو دیکھتے ہیں۔
"اگر آپ ایسے ہی خفا ہیں تو میں ویرا کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

انہوں نے بھولے منہ سے اسے بدامنی سے

ہندو جاتے تو لگتا یا ہر کوئی اور دنیا ہے ہی نہیں۔
باہر آتے تو لگتا دنیا تو ساری اندر تھی۔ پہلے ویرا سے
لے کر گھومتی رہی۔

یہ جو دو گورے سامنے کھڑے ہیں انہیں دیکھ کر تھوڑے
سے کس قومیت کے ہیں؟ ویرا نے دو گورے دیکھے تو انہیں
کی طرف اشارہ کرتے اس سے پوچھا یونی میں بھی اکثر
پوچھتی رہتی تھی۔

"دولوں انگریز ہیں۔" اس بار اسے یقین تھا اس کا
جواب ٹھیک ہو گا۔

ویرا نے تھوڑے لگا یا۔ "دولوں انگریز کیسے ہوئے؟"
"کیونکہ دولوں گورے ہیں اور۔" وہ ایک اور وجہ
ڈھونڈتی رہی تھی کہ ویرا کا ایک اور بلند بانگ تھوڑے
جنگل کی گزرتی تھی۔

"ایک امریکی ہے اور وہ سراسر آتش۔ تم پھر سے غلط
ہو۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"
"پتا چل جاتا ہے۔ تمہیں لگتا تو معلوم ہے تا
آتش کے کہتے ہیں؟"

امرد نے ہل میں سر ہلا دیا جبکہ وہ نہیں جانتی
تھی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کے یہاں سب گورے
رنگ والوں کو انگریز ہی جانتا اور کہا جاتا ہے۔ اب بھلے
سے وہ کینیڈا کا ہوا فرانس کل پانچ سو تیس رہ کر اسے
اندازہ تو ہو چکا تھا کہ وہاں قومیت کا حوصلہ دے کر کالی
بات کی جاتی ہے۔ بلکہ بات ہی قومیت سے شروع کی
جاتی ہے۔

"ملاں امریکی کا کافی سیف۔"

"ملاں مہلی کی ملاں ملے۔"

"ملاں جرمین سر کا پیکر۔"

اسے کوفت ہوتی تھی جب اس شخص کا نام بعد
میں لیا جاتا اور قومیت پہلے۔ ویرا اپنے کلاس لیکچر کا
ذکر کرتی تو ان کی قومیت سے شروع کرتی اور جب اسے
ویرا کو کوئی بات چینی ہوتی تو وہ کہتی۔

"ملاں جس کے بل لے ہیں۔ پلاسٹک سا۔"
جس کی کسی سبز آنکھیں ہیں۔ مشکل سا نام ہے۔

تھوڑے ہی دن پارٹمنٹ کا ہے ہالوں کی پانی بنانا
ہے۔

تو ان سارے معاملات میں ویرا اس کی ایک اچھی
استو تھی اور وہ خود بھی ویرا سے متاثر رہتی تھی۔
چلتے چلتے ویرا ایک گھنٹے کے سامنے رکھے ایک
بڑے سے کارٹون کے پاس کھڑی ہو گئی جو زبان باہر
نکال کر آئے جلنے والوں کو چرا رہا تھا۔ اس جن جیسی
ہی ویرا تھی زبان نکال کر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔
"ٹھیک ہی امرد۔" (جیسی تصویر بناؤ۔)

امرد نے بے طرح ہنستے اس کی تصویریں بنادیں۔
پھر ویرا نے ٹھیک ویسے ہی امرد کو کھڑے ہونے کے
لے کہا۔

امرد نے خود کو ویرا سے بہت بچانا چاہا لیکن اس
نے اسے اس جن کے ساتھ کھڑا کر دیا تو زبان باہر
نکالنے کو کہا۔ ہاں انہیں یہ سب کرتے کوئی نہیں دیکھ
رہا تھا۔ لیکن امرد کو لگتا تھا سب اسے ہی دیکھ رہے
ہیں۔ سب اپنے آپ میں گمن تھے دیکھنے کا دواچ وہاں
نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک سرسری نظر ڈال لیتے۔
اسی جن کے پاس کھڑے ہو کر ویرا نے وہ انگلیوں کو
زبان کے نیچے دے کر سٹی بجلی 'سر سے اوپر ہاتھ لے
جا کر تالی بجلی اور بائیں ہاتھ کو ہونٹوں کے کنارے رکھ
کر کہہ۔۔۔ "کی بن ہاں جیسی آواز بڑے شوق
اور خالص جنگلی انداز سے نکلی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"یہ پرنٹ ورک میں آنے کا اعلان ہے۔ میں
یہاں ایسے ہی اتھری رہتی ہوں۔" وہ ایسے اتھری دے
سکتی تھی کہ ویرا تھی۔
"تم جنگلی ہو۔"

"بھئی کسی مدی کو جنگلی نہ کہنا۔ ہم یوں زندگی
سے بچے زندگی کے کر سکتے ہیں زندگی کا سورج ہم
میں سے ہو کر رنگوں کو چمک دیکھتا ہے ہم موت
کی طرف میں دلن سر سبز چاہا ہوں کے تھوڑے لگاے
ہیں۔ یہ صرف ہم ہی کر سکتے ہیں۔ ہم جنگلی کیسے
ہوئے۔"

ڈرنک رہے وہی لور گاگ ٹیل بناتے لگا۔ س کے دونوں ہانڈوں پر کنبیوں سے اوپر تک ٹیٹو کھدے تھے۔ دائیں ہانڈ پر گھنٹی جھاڑیوں میں سے ایک خوشخوار بھیلوا دانت ٹکڑے آنکھیں چمکائے شکار پر جست لگانے کی تیاری کر رہا تھا اور بائیں ہانڈ پر وہی بھیلوا اپنے شکار کی گردن پر دوپے قرار تھا۔

”اس کا شکار ایک انسل کھوپڑی تھا۔“

امرد نے گراہیت سے اپنی نظریں پھیر لی۔ گاگ ٹیل بناتے اس نے ترچھی نظروں سے امرد کو دیکھا اور زیر لب ہنسنے لگا۔

”تمہیں یہ پسند آیا؟“ اس نے بھیلوے کی طرف اشارہ کیا۔

امرد نے منہ ہلایا ”بالکل نہیں“ زہر لگ رہے ہیں۔“

اپنی صاف گوئی کی شاید اسے توقع نہیں تھی۔ اس نے خود کو کلام میں مصروف کرنا چاہا اور زیر لب بڑبڑانے لگا۔

لچک دس منٹ بعد ڈی بے نے قل والیوم میں ڈسک لے لی۔ پہلے صرل ہلکا ہلکا میوزک بچ رہا تھا۔ باہر شام گہری ہو رہی تھی۔ ہارٹ راک کے کونے کھدوں میں سے ہواؤں کرنا ہجوم ڈی بے کے آگے جمع ہونے لگا۔ ڈسکولائٹس تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ امرد نے گھبرا گئی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اصل میں یہ کون سی جگہ ہے۔ وہ میڑھیاں اتر کر لور وہ ”تین راہ واریاں پار کر کے یہاں تک آئی تھی۔“

وہ جلدی سے انٹھی لور اپنی دانت میں راہ واریاں پار کر کے میڑھیاں اتر کر پار سے باہر آگئی۔ لیکن وہ دراصل ہارٹ راک کے ہی ایک دوسرے حصے میں آ گئی تھی جہاں جوا کھیلا جا رہا تھا اور جہاں جوتے کی بڑی بڑی میشین رکھی تھیں۔ وہ لور حواس باختہ سی ہو گئی۔ وادا کو اگر یہ سب معلوم ہو جائے تو اسے لینے خود اپنا سٹر آجائیں۔ وہ واپس اس جگہ آئی جہاں وہ رہا اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ لیکن وہ براہی تک نہیں آئی تھی۔

”ہم یونہی پانی سے جیسے ذمہ دلی کے کرشل ہیں۔“

امرد نے زیر لب اس قوت بخش جملے کو دہرایا اور وہ کھل کر مسکراتے لگی۔

دیرا کی باتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ ان میں سے احساس کمتری جھلکتی تھی۔ نہ ہی مایوسی۔ وہ کچھ اس انداز سے چلتی پھرتی مسکراتی لور باتیں کرتی تھی جیسے دنیا اس کے مستقبل کے لیے تیار کھڑی ہے اور اگر یہ دنیا اسے خوش آمدید کہنے پر آمادہ نہیں ہے تو وہ سرحمل اس کی پروا کرنے والی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی مانگ دنیا تخلیق کرنے کا وصف جانتی تھی۔

پرنٹ ورک کا ایک راؤنڈ لینے کے بعد وہ اسے ہارٹ راک کیفے لے آئی۔ جس کی بیرونی دیوار کے باہر ایک بڑا سا گٹار لٹکا اس خوشنود شنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ”یہ کیفے ہے؟“

دیرا گڑبگڑائی۔ ”ہاں کیفے بھی ہے اندر۔ لور بھی بہت کچھ ہے۔ تم پہلے کبھی ہارٹ راک نہیں گئیں۔“

”میں اس کلام کی پار سن رہی ہوں۔“

”تمہارے ملک میں نہیں ہے یہ۔“

”یہ کیا ہر ملک میں ہے۔“

”دنیا کا کون سا ایسا بد نصیب ملک ہو گا جو ہارٹ راک سے محروم ہو گا۔“

”ہے کیا اس میں؟“

”آجاؤ اندر۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

دیواروں پر چابھیا گٹار لٹک رہے تھے۔ کچھ پرانے فیشن کے کاؤ بوائے بیٹ بھی دیواروں پر آویزاں تھے۔ کیفے کی سجاوٹ دیکھنے لائق تھی۔ اندر جاتے ہی اسے کئی جانے پہچانے یونیورسٹی کے چہرے نظر آئے۔ پھر اسے اپنی بیٹی کے اسٹوڈنٹس کا ہجوم نظر آیا۔ ان سارے کھیلوں اور ہارڈ میں اسٹوڈنٹس کو رعایتی قیمت پر ڈر ٹکس اور کھانے ملتے ہیں۔

دیرا اسے بار ٹینڈر کے پاس بٹھا کر ضروری کلام کا کہہ کر چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ اس کے لیے ایک۔ سوئٹ ڈرنک کا آرڈر دے گئی تھی۔ بار ٹینڈر نے اسے

"میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔" ہارٹینڈر نے بہت شرات سے مسکرا کر امرد سے پوچھا۔
"مجھے باہر جانا ہے۔ کس طرف سے جانا ہے؟"
"فرنٹ ڈور تو بند ہو چکا ہے، تمہیں بیک ڈور سے جانا ہو گا۔"

"بیک ڈور کہاں ہے؟" اسے کیا معلوم تھا کہ ان پارٹ راک میں کیا اصول و ضوابط تھے آگے جانے کے لئے اور کہاں ان کے بیک ڈور تھے۔

ہاتھوں کو تیزی سے بچا کر اس نے اسے بتایا کہ پچھلا دروازہ کس طرف ہے۔ امرد کو فن بھیڑیے کھدے ہاتھوں کی حرکات کی قطعاً سمجھ نہیں آئی۔ وہی جے ساؤنڈ بدل چکا تھا۔ اس نے جانوروں کے چنگھاڑنے کی آوازیں گولڈن ہپ ہپ میوزک کے ساتھ مٹ کر کے فل و الیوم کر دیا تھا۔
امرد کے رنگ تیزی سے بدلنے لگے۔
تیزی سے ٹاک ٹیل بناتے۔

"We Love to Serre" کی ٹی شرٹ پہنے اس نے امرد کی طرف دیکھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے خود سے ہی کہا۔ امرد کو اسے پہلی نظر میں ہی پسند کر چکی تھی، لیکن اس کے ساتھ جانے سے خود کو روک نہ سکی۔ وہی جے کامیابی سے وہ میوزک بج رہا تھا جو سب کو جانوروں کی طرح چنگھاڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔

وہ آگے چلے لگا۔ وہ اس کے ساتھ تھوڑا فاصلہ رکھ کر پیچھے چلنے لگی۔ تین چار روٹیاں چل کر وہ تین بار میز دیاں اتر کر اس نے ایک دروازہ کھول کر کہا۔
"یہ ہے بیک ڈور تمہیں یہاں سے جاسکتی ہو۔"

"شکریہ۔" تیزی سے آگے بڑھی اور دروازے کے بار ہو گئی۔

لیکن وہ تو باہر کا راستہ ہی نہیں تھا۔ فوری شاک کے زیر اثر آنے سے پہلے اس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا گم روشنی والا کمرہ ہے جو مختلف چیزوں سے لٹا ہوا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس بہت سی خلی بو تھیں پڑی تھیں اور وہاں وہ قدم کھڑے ہونے کے

غلطہ کوئی جگہ نہیں تھی۔ بدبو کے بجائے تھے جو دم گھوٹ رہے تھے۔

دروازہ دھڑ سے بند ہوا۔ پھر فوری لاک ہوا اور چلا کر اس نے حواس باہر کا راستہ کھلنے لایا تھا کہ۔
"اب یہاں کئی بھیڑیے آئیں گے تمہاری گردن رو چنے۔"

دور اوپر ڈی جے نے انسانی خود ساختہ چیزوں کے ساتھ ایک دوسرے میوزک کو مٹ کر کے چلایا۔ فل و الیوم سے۔ پارٹ راک کیفے کا کلب بار اپنے عروج پر آگیا۔ امرد کی چیخ اس عروج میں دب گئی۔

اگر کوئی اس وقت اس کی شکل دیکھ لیتا تو جان جاتا کہ موت سے بھی زیادہ وحشت ناک اگر کوئی چیز ہو تو وہ اس وقت اس کی شکل پر چھائے خوف کے غلطہ کوئی اور نہیں تھی۔ اندھیرے کا رگڑا اس کی آنکھوں میں گھسا چلا گیا۔ اسے نظر نہ تھا وہ کیا چیز تھی کی تو اس کے دونوں کانوں سے سر کے اندر تھیں کر دینا تاک انداز سے گونجنے لگی۔ وہ جھلکی تھیں وہ تھی۔

جس کھوپڑی کو ہارٹینڈر کے بازو پر بنے بھیڑیے نے منہ میں دیوچ رکھا تھا۔ وہ وہی کھوپڑی بن گئی۔
مردہ شکار کی گئی۔ شکار ہو چکی۔

اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ اسے کچھ نظر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ سوچ کیوں نہیں رہا تھا۔ اس نے سر کو مسلسل دائیں بائیں جھٹکے دیے۔ اسے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا تھا۔ سر کو جھٹکے دینے سے اس کے سر میں نہیں سی اٹھی اور وہ دیوار کا سارا لے کر بیٹھنے لگا کھڑکی ہوئی بو تھوں کے ڈھیر بننے لگی۔ گھنٹہ میں بھی وہ اپنے سے بھیگ چکی تھی۔ سانی سی دیر میں ہی۔

اس کا ہاتھ کر اس بیک پر لگا۔ اس کا بیک اس کے ساتھ تھا۔ اس کے پاس فون تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون لگالا۔

وہ دیر اکو فون کرنے لگی۔ تیل جاری تھی۔ تیل جاتی رہی، لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔ اس نے مسیج لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی انگلیوں کی کپکپاہٹ نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ وہ سلاہٹا کو

فون نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پولیس کو تو ہرگز نہیں۔ ان کے علاوہ اس کے پاس صرف چند لوہے سرے لوگوں کے نمبرز تھے۔ وہ اپنی فون بک چیک کرنے لگی اور علیان پر آکر رک گئی۔

وہ ایک کلب کے کسی بے خانے میں بند کر دی گئی تھی اور خوف سے کلب رہی تھی۔ فون کلب کے جن کو ہٹس کرنے کے لیے اس نے اپنے جسم کی ہر ہر اہٹ کو قابو میں کیا۔

”ہیلو علیان۔ میں۔ امرد۔ مجھے کسی نے یہاں بند کر دیا ہے۔“ اپنے رونے پر قابو پاتے اس نے بستہ درنگ کر حملہ مکمل کیا۔

”ٹھیک ہے“ تم ابھی وہیں رہو بے ل۔ کونے میں خلی بو تکوں کے کریمس کے پیچھے ڈھکا رکھی ہے۔ تم اسے لے سکتی ہو۔ پولیس کو فون کرنے کی حماقت ہرگز نہ کرنا ورنہ تمہاری ڈیڈ بڈی بھی لن کے ہاتھ نہیں آئے گی۔“

امرد کے ہاتھ سے فون گر گیا اور اس کی ہشوی نکل کر دور جا گری۔ علیان کے فون پر۔ ہاریک اعصاب نیم زدیتے والی خوف کی لہر نے اس کے وجود کا احاطہ کیا۔ اب اس کے پاس ایک ہی حل تھا کہ وہ پولیس کو فون کرے۔ علیان ویر اور وہ لڑکا کون تھے۔ اس سوال کے بارے میں سوچتے ہی اس کی جان بھول کی الٹیوں میں آئے نکلتی تھی۔ ویر اسے بہانے سے لائی تھی پر کیوں۔ ایسے لے بند کرنے کے لیے۔ وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے اور علیان۔ یہ سب کیا تھا۔

سکپکپاتے ہاتھوں سے اس نے ہشوی کو فون میں ڈالا اور فون ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی۔ اگر پولیس آئے گی۔ اس کلب میں سے اسے پر تھ کرے گی تو یہ خبر اخبارات تک بھی جائے گی۔ یونیورسٹی کے ایک ایک اسٹوڈنٹ کو معلوم ہو جائے گا۔ تماثلین جائے گی۔ فون کو ہاتھ میں پکڑ کر گھنٹوں کو جوڑ کر وہ رونے لگی۔ ہانچسٹر میں پہلی بار پوری شدت سے۔ روتی رہی۔ روتی رہی۔ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی

جان نہیں تھا کہ وہ پولیس کو فون کرے اور بعد کا سوچ کر وہ روتی تھی۔ ایسے پولیس میں۔ کسی کلب میں بند کیے جانے پر۔ اپنی کم عقلی پر۔ اتنی دور پولیس میں پڑھنے والی لیب تک باہر جانے کے۔ امرد گئے کے راستے ہی ٹھیک سے یاد نہیں کر سکی۔

گھر سے باہر نکلنے کے لیے صرف وہ جوتے ہی ضروری نہیں ہوتے جو پہن کر باہر جایا جاتا ہے۔ ہوش مندی اور پھرتی بھی ضروری ہوتی ہے جو کرنے نہ دے۔ چوٹ تو ہرگز نہ گئے وہ۔ اس اسٹور میں پھلی بدبو اسے پاگل کیے دے رہی تھی۔ ڈی جے کے میوزک بے کرنے پر وہ اتنا گھبرا گئی تھی اس نے اس گھبراہٹ پر قابو کیوں نہ لیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کیا کہ پولیس میں تعلیم کی غرض سے آبد لڑکی ایسے گھبرا لگی اور بو کھانی پھرے۔

”اے خدا میری مدد کر کسی کو بھیج میرے لیے۔“ دعا کر رہی تھی ساتھ ساتھ ویرا کو فون کر رہی تھی کہ ایک دم سے وہ دانہ کھلا۔ اور سامنے خدا کی کھجی بند کھڑی تھی۔ ”علیان“

”امرد!“ اس نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ وہ حکام مار کر اسے پیچھے ہٹاتی تیزی سے بھاگ کر اوپر آئی۔ کاؤنٹر کے پیچھے گھڑے مسکراتے ہوئے اس منھوس انسان کو اس نے تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوگوں کے ساتھ ٹکرائی گرتی پڑتی ہارٹ براک سے باہر نکلے۔

”امرد! بات سنو۔“ علیان تیزی سے اس کے پیچھے بھاگتا ہوا تھا تھا۔ اسے آوازیں دے رہا تھا۔ لیکن وہ کی نہیں سیکھ رہی تھی۔

”کمال جا رہی ہو امیری بات سنو۔“ اس نے ایک دم سے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔ امرد پر جیسے کسی نے جلتا ہوا تیل اٹھیل دیا۔ اس نے اپنے بازو کو جھٹکے سے اس سے چھٹوا کر اس کے منہ پر ایک ٹھٹھروے مارا۔ ”دی برنٹ ورک کی مصروف ترین ریلو گزر پر کھڑے ہو کر کلم سے کم پچاس یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کو گولہ بنا کر تم تینوں نے مل کر مجھ سے جو گھسیادہ اق کیا ہے یہ اس کے لیے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو مجھ سے اب؟“ نہ چلائی۔
”کارل تھا۔ تمہیں کیسے بتاؤں میرا دوست بھی
ہے اور دشمن بھی۔“ جانتا ہے تم میری دوست ہو۔
اسٹوڈنٹ پارٹی میں وہ بھی تھا مجھے یہ نہیں معلوم کہ
اس نے تمہیں بند کیوں کیا۔ وہ کچن میں میرے پاس
آیا اور میرا فون مانگا اور وہ منٹ بعد اس نے مجھے بتایا کہ
اس نے تمہیں اسٹور میں لاک کیا ہے۔ اس سے
تفصیل جانے لہیر میں جلدی سے تمہارے پاس آیا
کیونکہ میں جانتا تھا تم کتنی جلدی پریشان ہو جاؤ ہو۔
اس سب میں میرا تصور کہاں ہے امرد؟“

امرد کے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ”تم لوگ
کس قدر ظالم ہو۔ کس طرح کی شرارتیں کرتے
ہو۔ کسے لکھوں میں مذاق بنا کر دکھا دیتے ہو۔ جان
نکل جیتے ہو۔ یہ سب ایسے کرتے ذرا نہیں
جھجکتے۔“

”میں ظالم نہیں ہوں امرد۔ تم مجھے ایک اور
تجربہ دے سکتے ہو، لیکن تم ایسے روؤ نہیں۔ میں کارل
سے نپٹ لوں گا۔“

امرد نے بیک سے چابی نکال کر دووانہ کھولا اور
تھیل کی پشت سے آنکھیں صاف کر لی اندر چلی گئی۔
عالیان باہری کھڑا کیا۔ جب ٹھیک وہ گھٹنے بعد
امرد کے کمرے کی باقی کل ہوئی تو وہ چلا گیا۔ کارل
کے پاس جا رہا تھا اسے ایک گھونسلار نے

ہارٹ راک کہنے کے ڈانٹنگ فلور جب میڈک
اپنے عروج پر تھا اور سب ڈانس کرتے کرتے چپاگل سے
ہو رہے تھے۔ اس وقت جا کر اس نے کارل ہائی لڑکے
کے منہ پر زور دار گھونسا مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور ہنستے
ہوئے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

”اس نے میرے ڈیڈیز کو برا کہا تھا۔“ کارل نے
اپنے ٹیوٹی طرف اشارہ کیا۔

”اس سے دور رہنا کارل۔“ عالیان کی آنکھیں اور
سرخ ہو گئیں۔

اس نے تھپڑ کی طرف اشارہ کیا اور اسے گھورتی
چیزی سے آگے بڑھ گئی۔ سڑک پر آکر اپنے لیے ٹیکسی
رکھنے لگی۔ گیس سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ دکھ سے
اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں۔ ”ویرا“
عالیان کی کلاس فیلو تھی اور وہ تیسرا بھی کزن کا کوئی کلاس
فیلو ہو گا اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سب کیوں کیا گیا۔
اسے یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کروا گیا۔ بس یہ
اس نے ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھنے ہی لگی تھی
کہ عالیان نے اپنے پیر کو ٹیکسی کے دروازے میں
پھنسا لیا۔

”میری بات سن کر جاؤ امرد۔“ اس نے قہقہے سے
کہا اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔
امرد نے منہ پھیر لیا اور تلخی سے اس کے پیر کو
پرے کر کے دروازہ بند کر دیا اور ڈرائیور کو چلنے کے لیے
کہا۔

وہ گھر پہنچی تو عالیان پہلے سے ہی دروازے پر موجود
تھا۔

”میری بات سن لو امرد۔ شور مت کرنا ملا نہیں
گی تو انہیں دکھ ہو گا۔“

”ہاں ہو گا دکھ انہیں کہ کن کے بیٹے نے کیا شان
دار حرکت کی ہے۔“

”نہیں دکھ ہو گا کہ تم نے مجھے تجربہ دار۔ ساری
دنیا بھی گولہ بین کر آجائے گی تو وہ کبھی یہ نہیں مانیں گی
کہ میں نے کچھ برا کیا ہے۔“

”چھوڑو مول جمو تک رہے ہو پھر ان کی آنکھوں
میں۔“ اسے برے وہ حکایتی اندر جالے گئی۔ وہ کن
میں سے کسی کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

”انسان زندگی میں اس وقت زیادہ تکلیف اٹھاتا
ہے جب وہ حقیقت جانے بغیر خود کو اندھا کر لیتا ہے۔
اور اپنے اس اندھے پن کا علاج بھی نہیں کروانا
چاہتا۔“

عالیان اپنے چوڑے مضبوط جسم سے اس کا راست
رو کے کھڑا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ ایک لمبے
عرصے تک ایسے کھڑا ہو سکتا ہے۔

"تمہاری گرل فریڈ ہے وہ۔" وہ مسکرا رہا تھا۔
 "میں سب سے ختم کرتا ہوں۔ بس بہت ہوں۔"
 "کیا ختم کرتے ہو۔"
 "جو کچھ بھی سناؤں سے ہمارے درمیان چلتا آ رہا ہے۔ ہمیں یہ بچکانہ کھیل پسند کرنا چاہیے۔"
 "ایک دم سے تمہارا موڈ کیسے بدل گیا۔؟ اس لڑکی کے لیے۔"

"وہ میری دوست ہے۔"
 "وہ تمہیں تو تمہاری اور بھی بہت ہیں۔ یہ کون سی دوست ہے جس کے لیے تم نے مجھے گھونسا مارا ہے۔"

"وہ مشرق سے آئی ہے۔ اسے اگلے سال کے ماحول کی علوت نہیں ہے۔ وہ ڈر جاتی ہے۔"
 "مردانہ۔ اسٹوڈنٹ پارٹی میں اسے ڈرتے میں نے بھی دیکھا تھا۔ کمال کا ڈرتی ہے وہ۔ بہت مڑا آتا ہے اسے ڈرانے میں۔ جب میں دروازہ بند کر رہا تھا تو اس کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ ویسے تم کب سے مشرق کو سمجھتے ہو؟"

اسے وہیں چھوڑ کر علیان واپس کچن میں گیا۔ کچن کا ہیڈ تھا۔ امرد کے پیچھے گھر تک جانے ہوئے اس نے اپنے مینجر کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ ضروری کام سے جا رہا ہے۔ ایک دو گھنٹے میں واپس آجائے گا۔ کمال بھی اسی سینٹر میں رہا تھا۔ جس میں علیان نے پرورش پائی تھی۔ اسے دوست بھی تھے اور اچھے دشمن بھی۔ ابتدا کمال نے کی تھی۔ اس نے سینٹر میں موجود ایک دوسرے لڑکے کے سوتے میں ہاتھ پاؤں باندھ دیے تھے اور منہ پر کپڑا لپیٹ دیا تھا۔ لڑکا بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب اس سلسلے کی تفتیش کی گئی تو کمال نے معصومیت سے ہاتھ علیان کی طرف اٹھا کر کہا۔

"اس نے میں نے خود اسے یہ کرتے دیکھا تھا۔"
 علیان اس کا منہ دیکھتا رہا۔ کیا لور مرٹا کے طور پر اسے پورا ایک مینٹ ایکسپلٹ کا کھانا ملتا رہا۔

پھر علیان نے کمال کے ذمے جولا نڈری ہوا کرتی

تھی۔ اس میں کافی کا گاڑھا محلول، سیاہی اور بیل کم چھا کر ڈال دی۔ مشین سے نکلنے کے بعد کپڑے باقیات استعمال کی عملی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اسے مزید کچھ بھی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ سب جانتے تھے کمال ہر وقت بیل کھایا کرتا ہے۔
 علیان نے یہ بدلہ ٹھیک آٹھ ماہ بعد لیا تھا۔ وہ کمال کے پاس جسے پورا ایک ہفتہ ہا بستر کے زمین پر سونے کی سزا ملی تھی کیا اور اسے کمال۔

"حساب برابر ہو گیا نا کمال۔"
 کمال نے پوری باتیں نکال کر دیکھا۔
 "بالکل۔"

"تو یہ حساب برابر ہو گیا نا؟" وہ ہرچہ سات مہینے بعد ایک دوسرے کو سمجھنے ایک دوسرے کی ماگ میں رہے۔ اسکول سے کالج لور کالج سے یونیورسٹی یہ سلسلہ نوٹ نوٹ کر چلا رہا۔

علیان نے اس کا بریک اپ کر دیا تھا۔ ایش سے مختلف طاقتوں کے دوران وہ اسے بتاتا رہتا کہ کمال کبھی کبھی اتنا جنونی ہو جاتا ہے کہ اپنے کپڑے تک پہنا دیتا ہے۔ صابن کھانے لگتا ہے۔ تھپو پیٹ لگتا ہے۔ اپنے سارے جوتوں کو بند پر بچھا لیتا ہے۔ لور ان پر سوتا ہے اور تو لور پھندا ڈال کر کم سے کم پانچ منٹ تک لٹکا رہتا ہے، کہتا ہے موت کا مزہ لے رہا ہوں۔

ایش کی شکل دیکھنے لائق ہوتی۔ وہ جانتی تھی علیان اور کمال ایک ہی جگہ رہے ہیں تو اب علیان سے زیادہ بہتر کمال کو اور کون جان سکتا ہے بھلا۔ وہ کیسا جنونی ہے یہ علیان سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔
 وہ نونوں میں ہر یکا ب ہو گیا۔

"وہ مجھے واقعی اچھی لگتی تھی۔" کمال نے اس کے روم میں آکر صرف اتنا کمال۔ وہ فوڈاک حد تک سنجیدہ تھا۔

"تمہیں سارا بھی اچھی لگتی تھی۔" علیان نے کندھے اچکاٹے۔ "ویسے کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایش کے پاس جاؤں لور اس سے یہ کہوں کہ جو میں نے کمال